مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قرآنی ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ لاہور

طلوع اسلام

جلد: 50 شمارہ: 06 جون 1997ء

خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)
25- بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660
ٹیلی فون: 876219 فیکس: 92-42-5764484

انتظامیہ چیئرمین	:	ایاز حسین انصاری
# ناظم	:	محمد لطیف چوہدری
مدیر مسول	:	محمد لطیف چوہدری
مجلس ادارت	:	میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر
ناشر	:	عطا الرحمٰن ارائیں
طابع	:	خالد منصور نسیم
مطبع	:	النور پرنٹرز 3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور
مقام اشاعت	:	25-B گلبرگ 2 لاہور 54660

زر سالانہ

ایشیا' افریقہ' یورپ	600 روپے
آسٹریلیا' امریکہ' کینیڈا	800 روپے
اندرون ملک فی پرچہ	15 روپے
اندرون ملک سالانہ	170 روپے

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں	ثریا عندلیب	6
گاہے گاہے باز خواں	ادارہ	10
اکیسویں صدی اور عورت	فرح ظفر	20
ایک خط ایک جواب	محمد ارشاد	23
وادی نمل کی ہشیار ملکہ	علامہ رحمت اللہ طارق	28
حضورؐ کا سفارتی نظام	مرزا ظہور الحق	34
طلاق حلالہ اور تھیاکریسی	علی محمد چدھڑ	43
Why is Islam The Only True Deen (ترجمہ)	ڈاکٹر منظور الحق	51

قارئین کو یہ دیکھ کر خوشی ہو گی کہ مجلّہ طلوع اسلام اپنے دور ثانی سے پاکستان کے ساتھ قدم بقدم چل رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

1۔ارباب حکومت پر واضح ہو

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات کسی طرح یونہی وجود میں آگئی اور اس کا کاروبار بھی یونہی ہنگامی طور پر چل رہا ہے۔ یونہی اتفاق سے کسی قوم کو آزادی مل جاتی ہے اور اتفاقی حوادث سے وہ چھن جاتی ہے۔ ان سے تو کچھ کلام نہیں لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ہر فیصلہ ایک قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے اور جو کچھ واقعہ ہوتا ہے وہ کسی خاص عمل کا نتیجہ ہوتا ہے' ان کے لئے اس حقیقت کا بیان نہ کسی تعجب کا باعث ہو گا نہ حیرت کا موجب کہ قوموں کی آزادی اور غلامی کے لئے بھی ایک اٹل قانون مقرر ہے جس میں کسی کے لئے کوئی تغیر و تبدل اور رعایت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہاں نہ کوئی قوم خدا کی چاہیتی اولاد ہے' نہ سوتیلی' یہاں ہر قوم کا معاملہ ایک ہی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور ہر فرد اور ہر قوم اس قانون سے یکساں فاصلے پر (Equidistant) ہوتی ہے۔ جس قانون کے مطابق قوموں کو آزادی ملتی اور چھنتی ہے' اسے اس ضابطہ قوانین (قرآن) کی اصطلاح میں " قانون استخلاف و استبدال قومی "

(Law of Succession and Substitution of Nations)

کہا جاتا ہے۔ قرآن نے جہاں اس قانون کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی تشریح و تبیین بھی اس انداز سے کر دی ہے کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام نہ ہو۔ کہیں کائناتی دلائل سے اور کہیں تاریخی شواہد سے۔ اس قانون کی تفصیل و تفسیر تو طویل ہے لیکن قرآن نے اسے ایک مقام پر چند الفاظ میں اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ نگہ بصیرت سے دیکھا جائے تو اس کے ارتکاز میں قوموں کی زندگی اور موت کے تمام اصول " ایٹم" بن کر دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہے کہ

وَاَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13/17)

یعنی زندگی اور بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ دنیا میں وہی نظام' وہی مملکت' وہی قوم زندہ رہ سکے اور آگے بڑھ سکے گی جو ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہو گی جس میں نوع انسانی کے لئے بیش از بیش سامان بہبود و منفعت ہو گا۔ کائنات کی طبعی زندگی میں بقاء للاصلح (Survival of the Fittest) کا قانون جاری ہے' لیکن انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں' "اصلح" وہی ہے جو " انفع " ہے یعنی جو' نوع انسانی کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس اصول کے دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نظام کو نفع رساں ہونا چاہیے۔ جو نظام نقصان رساں ہے وہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اور جو نہ نقصان پہنچاتا ہے نہ فائدہ' بقا اس کے نصیب میں بھی نہیں۔ یعنی یہی نہیں کہ جو نظام' زندگی

کی منفی اقدار (Negative Values) رکھتا ہے (اس کو نقصان رساں کہتے ہیں) وہ باقی نہیں رہتا' بلکہ جو جامد ہے' بقا اس کے حصے میں بھی نہیں۔ بقا اور استحکام صرف اس نظام کے لئے ہے جو زندگی کی مثبت اقدار (Positive Values) کا مظہر اور نفع رسانیوں کا حامل ہے۔ دوسرا گوشہ اس اصول کا یہ ہے کہ اس نظام کی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ' خاص جماعت' یا خاص پارٹی یا خاص قوم تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ اس کی منفعت عالمگیر اور حدود فراموش ہو۔ اگر کسی نظام کی منفعت کوشیاں کسی خاص طبقہ یا پارٹی تک ہی محدود ہو کر رہ جائیں' تو بھی اسے بقا اور استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف تو یہ نظام ہے۔ دوسری طرف وہ نظام ہے جسے قرآن "بخل" کا نظام کہہ کر پکارتا ہے۔ بخل کے معنی ہیں سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ اس نظام میں برسراقتدار گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر ان کے ماحصل کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کو دور حاضرہ کی اصطلاح میں' نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس نظام کے مظہر بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اور بڑے بڑے کارخانہ دار اور سوداگر ہیں۔ یہ طبقہ تعداد کے لحاظ سے ملک کی آبادی کا قلیل ترین حصہ ہے لیکن مملکت کی ساری دولت انہی کے قبضہ میں ہے۔ باقی آبادی ان کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ انہی میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایسے قوانین مرتب کرتے رہیں جن سے اس سرمایہ دار طبقہ کے مفاد محفوظ رہیں۔ یہ ہے وہ نظام جس کے متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ انہیں کچھ وقت کے لئے پیش پا افتادہ مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انہیں استحکام اور بقا کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ **وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ** (47/38) جو مفاد پرست نظام یا گروہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے وہ اگرچہ بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے لئے سب کچھ حاصل کر لیا ہے لیکن وہ درحقیقت اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر رہا ہے۔ وہ انہیں جھنجوڑ کر کہتا ہے کہ **وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ** (47/38) اگر تم نے ہمارے اس قانون کے (کہ باقی وہی رہے گا جو نوع انسانی کے لئے زیادہ منفعت بخش ہو گا) روگردانی کی تو سن رکھو کہ خدا کا قانون استخلاف و استبدال تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا۔ جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

❁ ❁ ❁

2۔ تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی ؟

ملک کی انتظامی مشینری کی دن بدن بڑھتی ہوئی خرابیوں کو دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ اس سوال کا جواب کوئی کچھ دیتا ہے کوئی کچھ' اور جب ایک حساس قلب یہ دیکھتا ہے کہ ان تمام جوابات کے باوجود حالات خراب سے خراب تر ہوتے

چلے جا رہے ہیں۔ تو وہ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے یہ صورت احوال بڑی تشویش انگیز بلکہ خطرناک ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کی وجوہات متعدد ہیں' لیکن ان میں ایک وجہ ایسی ہے کہ جو بالکل بین ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ارباب اقتدار کو اس کا علم اور احساس ہی نہیں ہوتا کہ عوام کن مشکلات سے دوچار ہیں' اور ان کی زندگی کس طرح سے اجیرن ہو رہی ہے۔ مثلاً" ہمارے وزیر خوراک (اس سے کوئی خاص فرد مراد نہیں) کو کبھی اس کا پتہ نہیں چل سکتا کہ ملک کے عوام کو کھانے پینے کی اشیاء حاصل کرنے میں کس قدر دشواری پیش آتی ہے۔ یہ چیزیں انہیں کس قدر گران نرخ پر ملتی ہیں' اور جو کچھ ملتا ہے' اس میں اصلی کتنا ہوتا ہے اور ملاوٹ کتنی' یہ اس لئے کہ وزیر صاحب کے اپنے مکان میں ہر شے صاف ستھری' نکھری' اجلی' خالص بالعموم بلادام' اور اگر وہ صاحب بہت بڑے دیانت دار ہیں تو کنٹرول کے نرخ پر' یا واجبی بھاؤ سے بلا کسی قسم کی دقت و دشواری کے پہونچتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں ہر شخص کو یہ کچھ اسی طرح اور انہی داموں پر میسر آ رہا ہے۔

یا مثلاً" ہمارے ہاں کے شعبہ مالیات کے وزیر صاحب کو اس کا علم ہی نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی عام آدمی نے (حکومت کے خزانے سے کچھ لینا تو ایک طرف اس میں) کچھ روپیہ داخل کرنا ہو تو اس کے لئے اسے کون کون سے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ کتنی توانائی ضائع ہوتی ہے' اور کتنی منتیں اور خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں اور بسا اوقات ذلتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اس قسم کے اپنے کام بغیر کسی دقت اور مشکل کے ازخود ہوتے رہتے ہیں۔ اول تو ان کا ماتحت عملہ خود ہی سب کچھ کر دیتا ہے اور اگر کہیں بہت بڑھا بوجھل پتھر راستہ میں آ جائے۔ تو ان کا ایک ٹیلی فون اسے اپنی جگہ سے ہٹا دیتا ہے۔

یا مثلاً" ہمارے لاء منسٹر صاحب کو اس کا کیا عملی تجربہ ہو سکتا ہے کہ کچہریوں میں لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور ایک شریف آدمی ان کی غلام گردش کی بھول بھلیوں میں کس بری طرح سے کھو جاتا ہے۔

یا مثلاً ہمارے وزیر امور داخلی کو کس طرح پتہ چل سکتا ہے کہ ایک پرامن شہری کے ساتھ تھانہ میں کیا سلوک ہوتا ہے اس وقت نہیں جب وہ وہاں بہ حیثیت ملزم کے گیا ہو بلکہ اس وقت میں جب وہ **مستغیث** کی حیثیت سے فریاد لے کر پہنچا ہو۔

ہم نے ان چند شعبوں کو محض بطور مثال پیش کیا ہے ورنہ زندگی کے کسی گوشہ کو بھی لیجئے۔ اس سے متعلق حاکم اعلیٰ کو کبھی معلوم ہی نہیں ہونے پاتا کہ عوام کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے' جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے کام بغیر کسی قسم کی دقت اور دشواری کے سرانجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ عوام کی حالت سے باخبر رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ ان حضرات کا عوام کے ساتھ ربط رہے' وہ اپنے آپ کو عوام میں کا ایک' اور عوام انہیں اپنے میں کا

ایک سمجھیں۔ لیکن اس قسم کا ربط تو ایک طرف ان میں اور عوام میں اس قدر بعد اور بیگانگی ہوتی ہے کہ عوام کی کوئی بات ان کے گوش مبارک تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ان میں سے جو صاحب کبھی اپنی مسند سے نیچے اترتے ہیں (یا اتار دیئے جاتے ہیں) تو انہیں اس وقت کسی حد تک معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں زندگی کن دشواریوں سے گذر رہی ہے۔ لیکن وہ بجائے اس کے کہ اصلاح حال کی طرف توجہ دیں۔ وہ اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ دوبارہ اسی قسم کی مسند اقتدار کسی طرح حاصل کرلیں۔ تاکہ ان کی ذاتی زندگی ان مشکلات سے محفوظ ہو جائے۔

ان حالات کو بہ چشم خویش دیکھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے سنا کہ مصر کے گورنر نے اپنے مکان کے سامنے ڈیوڑھی بنوائی ہے تو آپ نے یہ حکم کیوں بھیج دیا کہ اس ڈیوڑھی کو فوراً" مسمار کر دیا جائے۔ ان کی نگاہ دور بین و خدا رنگ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈیوڑھی عوام اور ان کے نمائندے کے درمیان حاجب اور دربان بن کر حائل ہو جائے گی۔

یاد رکھئے! جن لوگوں کے ہاتھوں میں عوام کی تقدیریں دی جائیں جب تک وہ سمیع و بصیر و خبیر و علیم نہ ہوں وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ وہ ہر شکایت کے جواب میں بس اتنا کہدینا کافی سمجھتے ہیں کہ لوگ نظم و نسق کی خرابیاں بیان کرنے میں خواہ مخواہ کا مبالغہ کرتے ہیں۔ ان سے کون کہے کہ۔

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی
تپیدن دل مرغاں رشتہ برپارا ؟

• • •

آپ طلوع اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

☆۔ اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنائیے

☆۔ اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے

☆۔ کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے

ممکن ہو تو اپنے علاقے سے طلوع اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آواز' ثریا عندلیب صاحبہ کی

جواب ہم میں نہیں ہیں۔

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں

طلوع اسلام کی اس مبارک تقریب پر قرآنی نقطہ نگاہ رکھنے والے بہن بھائیوں کے سامنے میں اپنی اس تمنا کا اظہار نامناسب نہیں سمجھتی کہ میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ یہ سن کر آپ مسکرا دیئے! ٹھیک ہے۔ بھلا زندہ رہتے ہوئے کون زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ کوئی انوکھی خواہش تو ہے نہیں یہ بجا فرمایا آپ نے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے لیکن حقیقت بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ زندگی محض سانس کی آمدو رفت کا نام نہیں' یہ تو کچھ اور شے ہے۔

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اور میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟ اس لئے کہ قرآن کریم کی تعلیم نے مجھے انسانی زندگی کے مرتبے سے روشناس کیا ہے۔ اس نورمبین نے میری شب زندگی کو سپیدہ سحر میں بدل دیا ہے۔ اس زندہ و پائندہ روشنی نے راہ ضلالت میں ڈگمگانے والے میرے قدموں کو جادہ مستقیم پر استقامت کے ساتھ چلنے کی قوت عطا کی ہے۔ اس ازلی و ابدی ضابطہ حیات انسانی نے مجھے زندگی کی قدرو قیمت سے آگاہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خداوند کریم کی دی ہوئی یہ زندگی ایک نعمت کبریٰ ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔

اللہ کے اس نور نے میری جہالت کے اندھیروں کی پیدا کردہ مایوسیوں کو ختم کر کے ہر طرف علم و یقین پر مبنی مستحکم امیدوں کی لازوال روشنی پھیلا دی ہے۔

یہ نور خداوندی ان قوانین خداوندی پر مشتمل ہے جن میں خدا کے بندوں کے لئے ایک عظیم الشان پیغام حیات ہے۔ یہ پیغام کیا ہے؟ انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے! خدا نے اپنی یہ مکمل کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ۔

آنچہ حق می خواہد آں سازدترا!

یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی ہے کہ ارض و سما کے مالک حقیقی نے مجھے اس بیش بہا زندگی کی نعمت سے اس لئے نوازا ہے کہ میں اس کے مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کر کے اعمال صالحہ کا دامن تھام لوں اور میں اس خوش بختی پر نازاں ہوں کہ رب العالمین نے مجھے اس امت کا ایک فرد

بنایا ہے جو تمام عالم انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" -- اور جس کے متعلق وہ یہ بھی کہتا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بھلائی کیا ہے۔ یہ کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحیٔ خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے' اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسند کرتی ہے۔یعنی مومن کی زندگی اس نصب العین کی حامل ہوتی ہے کہ پہلے وہ اپنی زندگی کو وحیٔ خدوندی کے قالب میں ڈھالتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام میں مددگار بنتا ہے جس نظام سے زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہوتی ہے۔

میں بھی زندگی کی بہاروں سے اس لئے شاداب ہونا چاہتی ہوں کہ ان قیمتی لمحات کا حق ادا کر سکوں اور اس ارشاد ربانی کی تصویر بن جاؤں کہ

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

میری صلوٰۃ اور میری قربانیاں' میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کی رب العالمینی کو عام کرنے کے لئے ہو جائے۔

خود ساختہ مذہب کی دنیا میں صرف اپنی ذات کی نجات کے لئے وعظ ملتے رہے اور فردا" فردا" اخلاقیات کے اسباق کو دہرا لینا کافی سمجھ لیا گیا۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہے مقصد حیات متعین کرے -- پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا -- ایک وہ تھی کھوکھلی عافیت پسندی کی زندگی۔

اس کے بعد زندگی کا رہبر نصیب ہوا اور اس کے توسل سے ذہن نے رخ موڑا تو قرآن حکیم کے ٹھوس دلائل اور محکم صداقت کی ہمہ گیری نے ان تمام باطل نظریات کو جھٹک کر الگ کر دیا اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" وَلَا تَفَرَّقُوْا-- کے واشگاف الفاظ نے بتا دیا کہ دین اسلام اجتماعی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔اس کے نزدیک مومنین کا نصب العین ایک اور صرف ایک ہوتا ہے۔ یعنی سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور فرقوں میں نہیں بٹ جانا۔ قرآنی فکر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اللہ کی رسی سے مراد اس کے قوانین ہیں جو قرآن کے اندر موجود ہیں' جو اس لئے موجود ہیں کہ اللہ کے بندے ان قوانین الٰہی کو عملی طور پر متشکل کر کے اس زندگی کو جنت بداماں بنائیں اور یوں اُخروی جنت کے حق دار بن جائیں۔

خدائے لم یزل کا عطا کردہ یہ دین اہل دنیا کو انفرادی طور پر جینے کا ایسا طریق سکھاتا ہے جس سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس نے جماعت مومنین کو امت کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اس امت کو اجتماعی زندگی کے طور طریقے بتائے ہیں اور یہ تاکید کی ہے کہ

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ

میری جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو انفرادی زندگی مت بسر کرو۔

میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر اجتماعی زندگی بسر کرو۔ اس سے تم جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو سکو گے۔ اس دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ مجھے بھی اس لئے زندہ رہنا ہے کہ میں اس فریضۂ خداوندی کو بہ حد امکان اور بہ طریق احسن پورا کر سکوں۔ مجھ پر تو دوہری ذمہ داری ہے کیونکہ میں اس امت کی ایک فرد ہی نہیں بلکہ خود ایک ام بھی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ کسی امت کی سربلندی کا راز اس کی امہات کے اس حسن کردار میں پوشیدہ رہتا ہے۔ جس کا خود نمونہ بن کر وہ اپنی گود کے پالوں کو منزل مقصود کی نشان دہی کرتی ہیں اور یوں افراد امت صراط مستقیم پر گامزن ہو کر صراط الحمید حاصل کرتے ہیں۔

مذہب کے اجارہ داروں نے میرا مقام میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ مجھے بلندیوں سے کھینچ کر پستیوں کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ دین کی آیات بینات نے میرا چھنا ہوا مقام مجھے واپس دلایا مجھے عورت کی عظمت سے آگاہ کیا۔ امومت کے منصب اعلیٰ کے لئے مجھے منتخب کیا۔ اور سچ یوں گویا ہوا۔ ؎

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درمکنون!

پھر میں زندگی کی ان حیات آور و درخشاں ساعتوں سے فیض یاب کیوں نہ ہوں' اور جو عظیم ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اس کو خدا کے پروگرام کے مطابق پورا کرنے کے لئے زندہ رہنے کی تمنا کیوں نہ کروں؟

زندگی عمل سے زندہ رہتی ہے۔ زندگی اور عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور عمل وہ جس سے دنیا کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ یہی اعمال صالحات قوانین خداوندی کے مطابق انسان کی تقدیر کا لکھا' بن کر اسے شرف و امتیاز کی زندگی عطا کرتے ہیں۔ ایسی بے مثل نعمت میسر ہوتے ہوئے کس دل میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا نہ ہو گی؟

مذہب نے اعمال کی نیکی اور بدی کے نتائج کا اس جیتی جاگتی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے ان کو محض آخرت کے حوالے کر کے ہمارے لئے خود فریبی میں مبتلا رہنے کی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ خدا تعالیٰ کی حیات افروز مستقل اقدار کے حامل دین نے اس خود فریبی کے پردوں کو چاک کر کے ہمارا رخ اس قانون مکافات عمل کی طرف موڑا جو پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اور ہمیں بتایا' کہ چاہے ہم دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیں' اس ازلی و ابدی قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ ہمارا ہر قدم قانون مکافات عمل کی طرف اٹھتا ہے اور ہمارے ہر عمل کا نتیجہ ہماری ذات پر مرتب ہو کر رہتا ہے۔ **فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○** اب میں نے جانا کہ یہ حقیقت خدا کی کتاب ہی بتا سکتی تھی کہ دل میں گزرنے والا خیال اور نگاہ کی خیانت بھی نتیجہ پیدا کر کے رہتی ہے اور اگر میں انسانیت کی زندگی بسر کرنے کی متمنی ہوں تو ہر گھڑی مجھے اس بات کو پیش نظر رکھنا ہو گا کہ چاہے کوئی پکڑنے والا ہو یا نہ ہو' کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو۔۔ میرا کوئی عمل نتیجہ پیدا

کئے بغیر نہ رہے گا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خدا کا دروازہ ہر شخص پر کھلا ہوتا ہے جب تک اس میں عمل کی قوت اور اس کے پاس عمل کا وقت باقی ہے۔ میں زندہ ہوں اور زندہ رہنا چاہتی ہوں تاکہ اعمال صالحہ کی روشنی سے معاشرے کی تاریکیاں دور کر سکوں۔

قرآن کریم کی بدولت مجھے یہ ایمان و ایقان حاصل ہوا ہے کہ نور کے آنے سے ظلمات کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور حق کے سامنے باطل نہیں ٹھہر سکتا۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○

بے شک حق کے سامنے باطل مٹ جانے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ یہ اس کا اٹل قانون ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا اس کے پروگرام یعنی قرآن کی رو سے نظام خداوندی کے قیام کی تکمیل ضرور ہو گی اور یہ زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ مگر خدا کے کام اس دنیا میں انسانوں کے دست و بازو سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس ذمہ داری کو قبول کئے بغیر تعمیر انسانیت کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ خدا نے ہمیں اپنی اس زندہ و پابند کتاب کا وارث بنایا ہے جو ہمیں یہ نوید دیتی ہے کہ اگر تم ایک قدم مشیت ایزدی کے مطابق اٹھاؤ گے تو تائید ایزدی سو قدم آگے بڑھے گی۔ جب ان نعمتوں کے جلو میں اس زندگی کی ندی رواں دواں ہو تو پھر دل میں حیات جاوداں کی تڑپ کیوں نہ پیدا ہو' اس کے ساتھ میری نگاہ پاک ہو اور میرا حوصلہ بے باک' میرا قلب کشادہ ہو اور میری ہمت بلند' میرا عزم راسخ ہو اور میرا عمل پیہم۔۔ تو یہ کائناتی قوتیں میرے سامنے کیوں نہ سجدہ ریز ہوں اور اس کے بعد قانون قدرت کے مطابق جب اس دنیا کو چھوڑنے کا وقت آئے تو میں اس اطمینان و سکون کے ساتھ فرشتۂ اجل کو لبیک کہوں کہ میں نے سعی و عمل کے فریضۂ خداوندی کو پورا کرتے ہوئے اس زندگی کا حق ادا کر دیا۔۔ اب موت بھی مجھے مار نہیں سکتی۔ اب اس کی گرفت سے بالا ہو چکی ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

○ ○ ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

گاہے گاہے باز خواں ۔۔۔۔

1۔قصور کس کا ہے؟

ایک صاحب قلب حساس کا خط ملاحظہ فرمایئے!

"کچھ ہی سال ادھر کی بات ہے جب میں ریلوے اسٹیشن پر بطور .... کام کرتا تھا۔ رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر مسافر خانے میں جا کر ایک کپ چائے پی۔ جو گرم ہونے کے باوجود سرد ہونٹوں سے لگنے کے بعد ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سردی میں مسافر خانے کے کونے میں ایک غریب خاندان جس پر غربت کو بھی شرم آئے' بیٹھا ہوا تھا۔ مرد جو مفلوک الحال ہونے کے علاوہ ٹی بی کے مارے خون تھوک رہا تھا۔ مجھے فارغ پا کر یا جانے کیا سوچ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ مجھے غالباً" یہ بتانے کی وقت تو پیش نہ آئے گی کہ مجھے ٹی بی ہے ہاں اس بات کا آپ کو علم نہ ہو گا کہ میں حیدر آباد' مل میں اچھی خاصی کمائی کرتا تھا۔ جب ٹی بی ہوئی تو مل والوں نے نکال دیا۔ دوا دارو کیا۔ افاقہ تو خیر کیا ہونا تھا۔ مگر ہاں اثاثہ ضرور ختم ہو گیا۔ بھائی کے پاس رہنے لگا تو کچھ روز بعد بھاوج کے کہنے پر بھائی نے دھتکار دیا۔ آخر بیمار سے پیار بھی کون کرے۔ کوئٹہ جا رہا تھا بغیر ٹکٹ ہونے پر یہاں گاڑی سے اتار دیا گیا ہوں۔ کھانے کو تو خیر پہلے بھی کچھ نہ تھا۔ البتہ پینے کو آنسو تھے۔ ہائے رے وہ بھی نہ رہے۔ کیا آپ مجھے' میری بیوی اور بچیوں کو کوئٹہ پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔ میں نے بچیوں کی طرف دیکھا۔ جن میں سے ایک کی عمر سات برس کے لگ بھگ اور دوسری کی تیرہ چودہ کے قریب تھی۔ دونوں بچیاں پھٹی ہوئی میلی سی ایک ہی چادر اوڑھے دونوں ایک دوسری کے ساتھ اکٹھی بیٹھی سردی کے مارے کانپ رہی تھیں۔ خاموش مگر کس حسرت سے ٹکٹکی باندھے مجھے چائے پیتے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس غریب خاندان کی کیا مدد کی اسے چھوڑیئے۔ دو چار روز بعد بھی جب اس خاندان کو وہیں پایا۔ تو میں نے چائے والے سے پوچھا کہ یہ لوگ ابھی تک کوئٹہ کیوں نہیں گئے تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ بھولے بادشاہو! ابھی سودا نہیں ہوا۔ مطلب؟ مطلب یہ کہ ایک زمیندار آیا تھا۔ وہ بڑی لڑکی کے آٹھ سو دے رہا تھا اور یہ بارہ سو مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں ہوا۔ مگر وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے اور جب رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پھر چائے پینے گیا تو وہ خاندان وہاں نہیں تھا۔ دکاندار نے بھی کہا کہ معلوم نہیں وہ کب اور کہاں چلے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ "سودا" ہوا یا نہیں اگر نہیں ہوا تو بھی ایسے سودے آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں اور اگر سودا ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمیندار اس بچی کو اپنے ہاں لے جائے

گا۔ اس کے ساتھ نوکروں سے بھی برا سلوک کیا جائے گا۔ کھانے کو اتنا دیا جائے گا کہ بمشکل زندہ رہ سکے۔ معصوم بچی کے سر پر اتنا کام ہو گا کہ صبح سے شام تک کرنے پر بھی ختم نہ ہو گا۔ اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ مفت کی بچی کو ہر وقت زدوکوب کیا جائے گا مگر کیا مجال جو اف بھی کر سکے۔ درد کا درماں نہ ہو گا۔ کوئی اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے والا نہ ہو گا۔ فرار ہونا تو درکنار تڑپ کر مر جانا بھی ایک بات ہے مگر بچاری کو تو اس پر بھی اختیار نہ ہو گا۔ کچھ سالوں بعد اس کی ذمہ داریاں تبدیل ہو جائیں گی۔ پھر ایک جگہ سے دوسری تیسری اور چوتھی جگہ بکنا شروع ہو جائے گی اور خدا جانے کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی۔

اس طرح اس بچی نے تمام عمر گناہ اور دکھوں میں گزاری۔ آخر اس گناہ اور دکھ کا ذمہ وار کون ہے ؟ اگر گناہ کو معصوم بچی کے باپ کے سر تھوپ دیا جائے۔ یا معاشرے یا حکومت کو ذمہ وار ٹھہرایا جائے۔ بہر صورت بچی کو جو دکھ ملے آخر وہ کس سلسلے میں؟ کس جرم میں ؟ کس قصور کی پاداش میں؟ ذمہ وار کوئی ہو یا قصور کرنے والا کوئی ہو اور پکڑی جائے بچی۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں ہے کہ " ہم ان کا بدلہ ان کی اولاد سے لیتے ہیں " یہ تو کسی طور مبنی بر انصاف نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ " ہر آدمی اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔" یا " جو خرابی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ " تو بھی بچی نے اپنے کئے کا پھل نہیں پایا۔ بچی نے کون سا گناہ کر دیا تھا۔ جس کی پاداش میں اس کی تمام عمر دکھ میں بیتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس بچی کو اگلے جہان جا کر دکھ کے بجائے سکھ ملے گا۔ تو یہ بھی مبنی بر انصاف نہیں۔ کہ قدرت نے اسے اس جہان میں تو سکھ نہ دیا بلکہ الٹا سکھ کے بجائے (اور لطف کی بات یہ کہ بغیر کسی گناہ کے) دکھ دیا۔

ان باتوں کو جوں جوں سوچتا ہوں پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا آپ اس اضطراب کو دور کر سکیں گے۔؟ "

طلوع اسلام

اسی قسم کے تھے وہ مقامات جہاں ذہن انسانی نے اپنے عجز کا مظاہرہ مختلف انداز سے کیا۔ اس نے کبھی (عیسائیت کے عقیدہ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا اور اس کی پاداش میں دکھ جھیلتا ہے۔ کبھی (یونان سے برآمدشدہ اور ہندوؤں کے اپنائے ہوئے عقیدہ تناسخ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ کہیں اس نے (مجوسیوں کے تتبع میں اختیار کردہ' مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے) یہ کہا کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر سے متعلق ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جن کا دل (مہاتما بدھ کی طرح) زیادہ رقیق تھا انہوں نے' اس قسم کے دو چار واقعات دیکھ کر' خود دنیا سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ اگر ان کے دل جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے' حقائق کا بے نقاب سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو اس بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ اس طرح اس کے سامنے یہ حقیقت آ جاتی' کہ فرد'

معاشرہ کا جزو ہوتا ہے۔ جس قسم کے معاشرہ اس قسم کے افراد کے حالات۔۔۔ غلط معاشرہ میں بے گناہ افراد بڑے دکھ جھیلتے اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ اور اس معاشرہ کا مفاد پرست طبقہ انہیں "گناہ اول" "تناسخ" یا تقدیر کے عقیدوں میں الجھائے رکھتا ہے۔ تاکہ ان کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔ اگر انہیں بتا' اور سمجھا دیا جائے کہ ان کی مصیبتیں اور تکلیفیں اسی معاشرہ کی پیدا کردہ ہیں تو وہ اٹھ کر اس معاشرہ کو زیر و زبر کر دیں اور اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دیں۔ غلط معاشرہ کا یہی وہ "فتنہ" ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے محتاط رہو کیونکہ اس کی خرابیاں انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جو ان کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس آگ کے شعلے دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔ (8:25)

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہماری نگاہ ان تکلیفوں کی طرف تو جاتی ہے جو غلط معاشرہ میں ہمیں اٹھانی پڑتیں ہیں۔ ان کے لئے ہم پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سزا ہمیں کس جرم کی پاداش میں مل رہی ہے۔ لیکن معاشرہ کی طرف سے ہمیں جو سہولتیں میسر ہوتی ہیں' ان کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتے (اور کہتے) کہ ہم نے (انفرادی طور پر) وہ کون سے کار نمایاں کئے ہیں جن کے صلہ میں ہمیں یہ سب آسانیاں میسر ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) انگریزی طب کی کتابوں میں ایک تصویر دیکھنے میں آئے گی۔ آج سے قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل کے زمانہ ہے۔ یونان کا ملک۔ ایک بادشاہ کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا ہے جس کے متعلق اطبا کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ بادشاہ کو فرش پر لٹا رکھا ہے اور چار پانچ دیو ہیکل غلام اسے چاروں طرف سے دبائے ہوئے ہیں کہ وہ ہلنے نہ پائے۔ ایک "سرجن" آری سے اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے دھک رہے ہیں۔ جن میں لوہے کی سلاخیں گرم ہو رہیں ہیں۔ پاس ہی کڑاہی میں تیل اونٹھ رہا ہے۔ جب آری سے ٹانگ کٹتی ہے' تو دوسرا طبیب' اسے لوہے سے داغتا ہے اور اس پر گرم گرم تیل ڈالتا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے اور زخم جل کر سوکھ جائے۔ آپ سوچیے۔ کہ اس عمل جراحی میں اس مریض (بادشاہ) پر کیا گزرتی ہو گی! اس نے چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

اس سے اگلے ہی صفحہ پر دور حاضر کے ایک کلینک کی تصویر ہے جس میں سرجن نے مریض کو ایک ٹیکہ لگا کر بے حس کر دیا ہے اور نہایت اطمینان سے اس کا اپریشن کئے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بادشاہ نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر جانکاہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ اور ہم نے کون سے "اعمال صالحہ" کئے ہیں جن کی جزا میں ہم اس قدر آرام اور راحت سے اپنا علاج کر لیتے ہیں۔ یہ ہے معاشرہ میں افراد کی حالت کا نقشہ۔

یہ مثال طبیعی احوال و کیفیات کی ہے۔ اسی سے تمدنی اور عمرانی احوال و کیفیات کا اندازہ لگا لیجئے۔ جب اور جہاں معاشرہ' صحیح اقدار انسانیت کا حامل ہو گا' افراد کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب وہ غلط بنیادوں پر متشکل ہو گا' افراد مصیبتیں بھگتیں گے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو

بے نقاب کیا اور کہا کہ بے گناہ افراد کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ غلط معاشرہ کو صحیح معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم رہنے دینا اور افراد کی مصیبتوں پر آنسو بہانا (یا خیر خیرات سے ان کی تکالیف کو دور کرنے یا ان میں کمی کرنے کی کوشش کرنا۔ حالانکہ اس سے ان کی طبعی تکالیف تو دور ہو سکتی ہیں' لیکن ان کے شرف انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے' ایک قلب حساس کے نزدیک اس کی تکلیف' طبعی تکلیف سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتی ہے) یا تو کمزوری اعصاب کی دلیل ہے اور یا مفاد پرست گروہ کی فریب کاری کا مظہر جس کا آلہ کار مذہبی پیشوائیت بنتی اور مظلوموں کو غلط عقائد کی افیون پلا کر سلائے رکھتی ہے۔ ان مصیبتوں کا صحیح علاج غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ کی تشکیل کے سوا کچھ نہیں۔

صحیح معاشرہ کا قیام وہ عمل صالحہ ہے جس کا خوش گوار اور حیات بخش ثمرہ تمام (موجودہ اور آنے والی نسلوں تک کے) افراد معاشرہ کو ملتا ہے۔ اور غلط معاشرہ کو قائم کرنا' یا اس کے قائم رکھنے میں ممد و معاون بننا (خواہ یہ معاونت بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ) وہ جرم ہے جس کی پاداش میں افراد معاشرہ اس قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے اور دکھ جھیلتے ہیں۔۔۔۔ غلط معاشرہ کو بدلنے والے افراد بھی اپنی ان کوششوں میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی ذات کی ایسی نشو و نما ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں طبیعی تکالیف اور مصائب ہیچ ہو جاتے ہیں۔

2۔نظام ربوبیت قائم کیسے ہو؟

سوال یہ ہے کہ قرآنی نظام ربوبیت جس کا طلوع اسلام پیامبر ہے وہ قائم کیسے ہو گا؟

اس سوال کے جواب سے پہلے' ایک پس منظر کا سامنے لانا ضروری ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اس نظام کی دعوت دی ہے تو دنیا میں (حضورؐ کے سوا) کوئی مسلمان نہیں تھا۔ حضورؐ کو قرآن نے اول المسلمین کہا ہے۔۔۔ آپؐ نے یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت پیش کی۔ لوگوں نے اس پر غور و فکر کیا۔ جو اس سے متفق ہوا' وہ اس دعوت کو قبول کر کے' اس انقلابی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے لئے اسے ایک معاہدہ کرنا ہوتا ہے کہ " میں نے اپنا مال اور جان بیچ دیا ہے " یہ تھی وہ جماعت (سوسائٹی) جس کے اراکین' اس نظام کے عمل بردار تھے۔ نبی اکرمؐ ان کی صحیح تعلیم و تربیت فرماتے تھے۔۔۔ یہ حضورؐ کا فریضہ تھا۔۔۔ لہٰذا' ان کے لئے اس نظام کی اقامت' ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

لیکن اس وقت صورت مختلف ہے۔ اس وقت پہلے سے ایک جماعت موجود ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔۔۔ اپنے آپ کو مسلمان تو کہتی ہے۔ لیکن اس نے معاہدہ پر دستخط نہیں کئے جس کی رو سے ایک شخص اس جماعت کا ممبر بنتا تھا۔ دستخط کرنا تو ایک طرف' ان کے ذہن میں اس معاہدہ کا تصور تک نہیں۔

لیکن انہیں غیر مسلم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان کا دعوے تو بہرحال یہی ہے' کہ ہم خدا کے احکام کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔۔۔ ان کی موجودہ حالت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے

خدا کے احکام ان کی اصلی شکل میں پیش ہی نہیں کئے گئے۔ یہ اسی اسلام کو سچا دین سمجھ رہے ہیں جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔

لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظام زندگی کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس نظام کو قانوناً" نافذ کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ موجودہ مسلمانوں پر اس نظام کو قانوناً" نافذ کرنا ان پر زبردستی کرنے کے مترادف نہیں ہو گا اس لئے کہ ان کے مسلمان ہونے کے دعوے میں یہ بات مضمر (implied) ہے کہ یہ قانون خداوندی کی اطاعت بہ طیب خاطر کریں گے۔ اس لئے انہیں صحیح قرآنی نظام کا پابند بنانا اس مضمر (Implicit) کو صرف مشہور (Explicit) کرنا ہے۔ ان پر کچھ زبردستی ٹھونسنا نہیں۔

لیکن یہ عبوری دور کا پروگرام ہو گا۔ اس لئے یہ نظام اپنے حقیقی رنگ میں اسی صورت میں متشکل ہو سکتا ہے۔ جب اس کی صداقت' انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو صحیح اسلامی نظام کو تعلیم اس انداز سے دیں کہ اس کی صداقتیں ان کے دل کی آواز بن جائیں۔ اس طرح یہ آنے والی نسل اس انداز کی مسلمان ہو گی جس انداز کے مسلمان رسول اللہؐ کی دعوت پر لبیک کہنے والے تھے۔ یہ جماعت مومنین اس نظام کو آگے لے کر چلنے کے قابل ہو گی۔

یہ ہے کرنے کا کام--- لیکن اس کے لئے بڑی ہی مومنانہ نگاہ اور جرأت مندانہ قلب کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے کہ یہ انقلاب' خود اپنے ہاں کی' اور اس کے بعد ساری دنیا کی ملوکیت' سرمایہ داری' اور مذہبی پیشوائیت کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ ہو گا۔ اور ایسی جنگ وہی مول لے سکتا ہے جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) " قلندرانہ اداؤں اور سکندرانہ جلال" کا مالک ہو--- یعنی ایک مرد مومن --

اور یہی وہ جنس گراں مایہ ہے جو آج نایاب ہے-- لیکن اس کے باوجود ہم ناامید نہیں۔ اس دنیا میں انسانی عمرانیت کا منتہٰی وہی ہے جسے قرآن کریم نے جنتی معاشرہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرہ کو قائم ہونا ہے اور وہ قائم ہو کر رہے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

آوازہ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

3۔زر مہر

یہ واقعہ ہے ایک مجلس نکاح کا۔ مہر کی بات چلی تو لڑکی والوں نے ایک خطیر رقم بطور " حق مہر" تجویز کی۔ سننے والوں نے اسے اس طرح سنا جیسے اس سوال کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں اور " ہاں ! ٹھیک ہے " کہہ کر آگے بڑھنے لگے۔ دولہا سہرا باندھے خاموش بیٹھا تھا--- نکاح کی تقریب پر دولہا کا

خاموشی سے بیٹھے رہنا آداب عروسی کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس نے بات آگے نہ چلنے دی اور آہستہ سے کہا کہ مجھ میں اتنی رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں۔ یہ اتنی رکھئے جتنی میں ادا کر سکوں۔

اس پر لڑکی والوں کی طرف بیک وقت دو تین آوازیں اٹھیں کہ مہر ادا کرنے کے لئے تھوڑی ہوتا ہے۔ اسے تو بس لکھا جاتا ہے۔ کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے۔ اس سے لڑکی کی عزت مقصود ہوتی ہے۔

اس پر دولہا نے ذرا بلند آواز سے کہا کہ میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ یہ رقم یونہی رسما" لکھ دی جاتی ہے۔ دینا دوانا کسی کو نہیں ہوتا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ رقم میرے پاس نقد موجود ہوتی تو میں اسی وقت ادا کر دیتا۔ لیکن چونکہ میں اسے نقد ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ میرے ذمہ قرض واجب الادا ہے۔ اس قرض کو مجھے اپنی اولین فرصت میں ادا کرنا ہو گا۔

اس پر پانچ سات آوازیں ادھر ادھر سے بلند ہو گئیں کہ واہ! یہ نئی بات ہے۔ ہم سب کے مہر کتنے کتنے ہی باندھے گئے تھے۔ کسی نے ایک پائی بھی ادا نہیں کی۔

اب دولہا سے نہ رہا گیا۔ اس نے چہرے سے سہرا الٹا۔ اور بلند آواز سے کہا کہ میرے بزرگو! نکاح ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے' ایک مرد اور ایک عورت' باہمی رفاقت کی ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سے حقوق اور ذمہ داریوں کا اقرار کرتے ہیں۔ مہر اسی معاہدہ کی ایک شق ہوتی ہے۔ آپ حضرات ہماری اس نئی زندگی کے پہلے ہی دن مجھے یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ یہ معاہدہ یونہی رسمی ہوتا ہے۔ اسے پورا نہیں کیا کرتے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس معاہدہ کے وقت پہلے ہی سے نیت کر لی جائے کہ اسے پورا نہیں کرنا' کہ کیا اسے معاہدہ کہیں گے یا فریب دہی ؟ اور جس رشتے کا آغاز ہی فریب دہی سے ہو' اس کے انجام کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔

ان الفاظ پر بجائے اس کے کہ ان " بزرگوں " کی نگاہیں ندامت سے جھک جائیں۔ وہ الٹے بپھر کر بولے۔ تم ہمیں فریب کار سمجھتے ہو۔ دیکھو اس زمانہ کے نوجوانوں کی حالت' اپنے بزرگوں کو فریبی کہتے ہیں۔ اگر یہ فریب ہے تو ہم ہی فریبی نہیں' ہمارے بزرگ بھی سب فریبی تھے۔ اس لئے کہ یہ رسم آج کی نہیں' صدیوں سے ایسے ہی چلی آتی ہے۔

اور حیرت ہے کہ اس بھری محفل میں ایک فرد بھی ایسا نہ نکلا جو اٹھ کر اس سعادت بخت نوجوان کی پیشانی چوم لیتا اور کہتا کہ شاباش بیٹا! قوم کو تمہارے جیسے نوجوانوں پر ناز ہے جو معاہدہ کی پابندی کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود دولہا قطعا" نہ گھبرایا۔ وہ اپنی بات پر جما رہا اور بار بار دہراتا رہا کہ آپ کچھ بھی سمجھئے اور کچھ بھی کہئے' مجھے تو اس رقم کو ادا کرنا ہے۔ اور میں جو وعدہ کروں گا' اسے پورا کروں گا۔ اس کی اس جرأت حق گوئی اور اصول پرستی کا نتیجہ تھا کہ مہر اتنا ہی باندھا گیا جتنے کے ادا کرنے کی

اس میں استطاعت تھی۔

طلوع اسلام

ہم اس فروز بخت نوجوان کو دلی مبارک باد دیتے ہیں جس نے اپنی ہمت اور بے باکی سے ایک ایسی غلط رسم کو توڑا جس نے واقعی ہماری قوم کو (غیر شعوری طور پر ہی سہی) فریب کار بنا رکھا ہے اور ہم مبارک باد دیتے ہیں اس کی خوش بخت بیوی کو جسے اس قسم کا رفیق حیات ملا جسے اپنے معاہدات کی پابندی کا اس قدر احساس ہے اور مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں اس خاندان کو، جس نے اس قسم کے صالح نوجوان سے عزیز داری کے جدید تعلقات وابستہ کئے ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ خدا اس نوجوان کو اس قسم کی جرأت اور اصول پرستی کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے اور اس کا یہ اقدام دوسرے نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔ ازدواجی زندگی سے متعلق احکام کے سلسلہ میں خدا نے کہا تھا کہ --- وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا" (2/231) دیکھنا! احکام خداوندی کو مذاق نہ بنا لینا -- ہم نے انہیں واقعی مذاق بنا رکھا ہے اور اس پر شرمانے کی بجائے فخر کرتے ہیں۔

⁂

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	اتوار	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعہ بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ:

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون: کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیدر آباد (بھارت) میں قرآن کی آواز

قرآنی تعلیمات پر مبنی کتاب

THE HOLY QURAN AND OUR DAILY LIFE

کے فاضل مصنف ڈاکٹر میر مصطفےٰ حسین صاحب حیدر آباد (بھارت) سے لکھتے ہیں کہ یوں تو قرانک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ایسے اجتماعات اکثر ہوتے رہتے ہیں جن میں علامہ غلام احمد پرویزؒ کی پیش کردہ قرآنی فکر پیش کی جاتی ہے جسے لوگ بے حد پسند کرتے ہیں۔ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جنہیں صاحبان عقل و بصیرت کہا جا سکتا ہے ان کے علاوہ تو وہی باقی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب، کور مادر زاد و نور آفتاب " تاہم پچھلے دنوں (16 مارچ 1997ء) میری کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی رونمائی کے لئے ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں نیشنل مائناریٹیز کمشن گورنمنٹ آف انڈیا کے سابق چیرمین جسٹس محمد سردار علی خان کے علاوہ **کشمیر** یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شاہ منظور عالم اور حیدر آباد اگریکلچر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اپا راؤ نے بھی شرکت کی۔ قرآنی فکر کے حوالے سے بہت سی مفید باتیں ہوئیں جنہیں حاضرین نے دلچسپی سے سنا۔ عمدہ کاغذ پر چھپی ہوئی، ڈاکٹر صاحب کی اس خوبصورت کتاب کا پہلا ایڈیشن مارچ 1995ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو سال کے اندر اندر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی جاننے والے ان خواتین و حضرات اور بچوں کے لئے جو اپنی زندگی قرآن کے سانچے میں ڈالنے کی تمنا رکھتے ہوں یہ وقت کی بہترین کتاب ہے تقریب رونمائی کی چند تصویری جھلکیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مدیر

سرزمین بھارت میں قرآن کی آواز

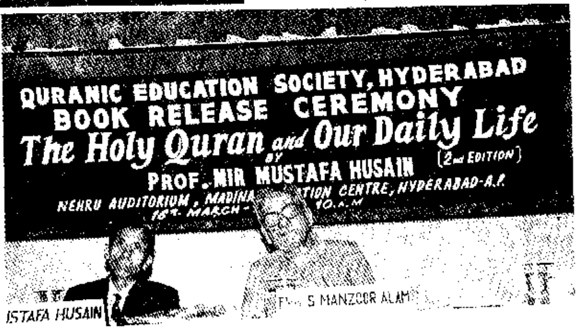

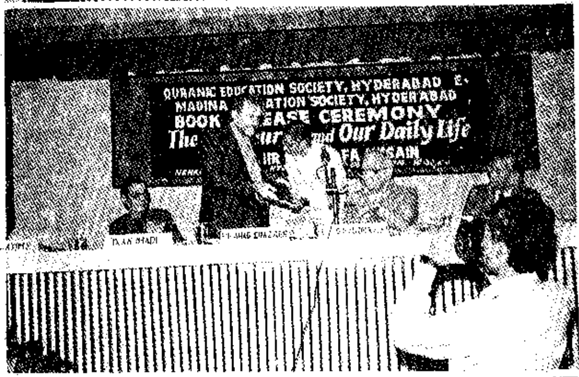

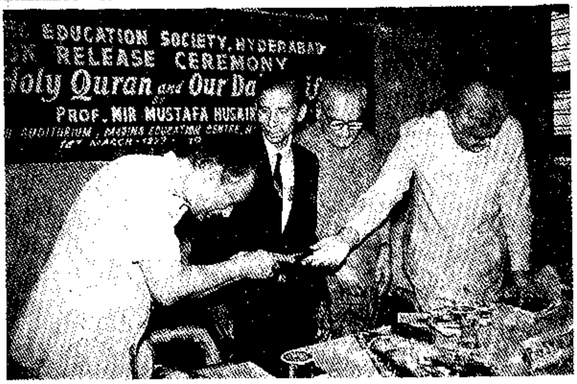

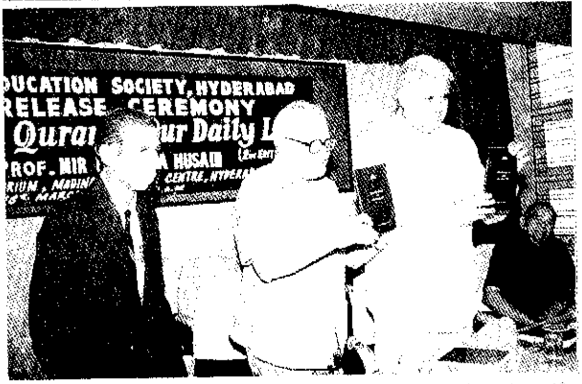

طلوع اسلام منکر حدیث ہے!

..... یہ الزام تو آپ نے سنا ہو گا.....

لیکن یہ حقیقت شاید ہی آپ تک نہیں پہنچی ہو گی کہ :-

☆۔ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟
☆۔ یہ کس طرح مرتب ہوئیں؟
☆۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے؟
☆۔ اقرار و انکارِ حدیث سے کیا مراد ہے؟

اس باب میں طلوع اسلام کا مسلک کیا ہے اور وہ جو اسے منکر حدیث بتاتے ہیں' وہ خود کس طرح منکر حدیث ہیں؟ علم حدیث کے موضوع پر یہ جامع کتاب ہے جسے

مقام حدیث

کے نام سے بڑے سائز میں شائع کیا گیا ہے !

اس قدر پُر ازمعلومات ہے کہ اس کے مطالعہ سے آپ بیسیوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ !

قیمت (علاوہ ڈاک' پیکنگ خرچ) اعلیٰ ایڈیشن۔ /Rs. 120
سٹوڈنٹ ایڈیشن۔ / Rs. 45

مینیجر طلوع اسلام ٹرسٹ

25۔ بی گلبرگ 2۔ لاہور

●●●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرح ظفر

اکیسویں صدی اور عورت

کجھ کہن نوں جی پیا کردا اے
کجھ کہن توں وی پیا ڈردا اے
کجھ کہواں تے پاگل کہندے نیں
چپ رہواں تے سینا سڑدا اے
کجھ کہن نوں جی پیا کردا اے

کرہ ارض پر حوا کی بیٹیوں کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا۔ تاریخ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ دنیا چاند کی فتح، خلا کی تسخیر اور ابلاغ کی ترقی کے دور میں داخل ہو گئی لیکن عورت آج بھی پاؤں تلے جنت اور سر پر مجازی خدا کا سایہ لئے گھر کا بے اجرت چولہا جلانے بجھانے میں مصروف ہے۔ مجبور ہو کر جو روزی کی تلاش میں گھر سے باہر نکلی تو خوف و ہراس سے دوچار ہوئی۔ کہتے ہیں پاکستان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی شرح اموات زیادہ ہے۔ پاکستانی معاشرے میں عورت کا مقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگا لیجئے۔

سندھ کا واقعہ ہے جہاں ایک کسان نے پانی چوری کرنے کے جرم میں اپنے کسان ساتھی کو قتل کر دیا اور چھپنے کے لئے گھر آ گیا۔ ماں نے کہا کہ یہ تمہاری عورت (بیوی) کس لئے ہے تم زندہ رہو گے تو اور بیوی آ جائے گی اور اگر تم ہی زندہ نہ رہے تو یہ عورت کس کام کی۔ اس آدمی نے اپنی بیوی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور بیوی کے اس آدمی کے ساتھ جس کو مارا تھا ناجائز تعلقات ظاہر کر کے اپنی جان بچا لی۔

نیشنل ویمن سٹڈی کے ایک بین الاقوامی فورم کی 1995ء کی رپورٹ کے مطابق گذشتہ دہائی میں جہاں پاکستان میں عورتوں کے ساتھ جبرو زیادتی کے واقعات میں اضافہ ہوا' وہاں مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے دیگر ممالک میں بھی اندوہناک اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ قحط زدہ علاقوں میں ایتھوپیا اور صومالیہ میں روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر نوجوان لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر رپورٹ میں اسے " ریپ " کی واردات نہیں بلکہ یہ کہا گیا کہ " کچھ لو اور کچھ دو " کے اصول پر باہمی رضا مندی سے ایسا ہوا۔ عورتوں کی جبری آبروریزی کا گراف ہر سال تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ 1980ء میں 640 کے مقابلے میں 1994ء میں 3030 عورتوں پر مجرمانہ حملہ کے واقعات ریکارڈ کیے گئے۔ 1995ء سے 1997ء جاری واقعات کا تو حساب ہی نہیں۔

آئی پی ایف کے تحت شائع ہونے والے جریدے پیپل کے ایک مطبوعہ مضمون " بیٹیاں کس

طرح مصائب کا شکار ہوتی ہیں؟ " میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں کم خوراکی کا شکار ہیں۔ مثلاً" پانچ فیصد لڑکوں کے مقابلے میں چودہ فیصد لڑکیاں کم خوراکی کا شکار ہیں۔

بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہونے کا دعویدار ہے مگر اس سرزمین پر باشندوں کے حقوق کو جس بے دردی سے کچلا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے بھارت کا جو سہ لفظی تعارف سامنے آتا ہے وہ ہے " سرزمین جرم و استحصال " بھارت کا خاندان زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ جس عورت کو اس کی ساس اور شوہر پسند نہیں کرتے 15000 روپے دے کر مقامی اوجھا (روحانی ڈاکٹر) سے چڑیل اور منحوس کا سرٹیفکیٹ با آسانی حاصل کر لیا جاتا ہے' اس کے بعد وہ عورت زندہ رہنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف چار سالوں میں 8700 خواتین اس خانگی تشدد کا نشانہ بن چکی ہیں۔ وہاں "دخترکشی" کا رواج ابھی تک موجود ہے۔ بہار' تامل ناڈو' آندھرا پردیش' راجستھان اور اڑیسہ میں اس کا زور سب سے زیادہ ہے۔ عورت کے تقدس' احترام اور وقار کی پامالی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر 24 گھنٹے میں 1500 خواتین کسی نہ کسی قسم کی زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ بی بی سی کی 15 جولائی 1995ء کی ایک رپورٹ کے مطابق خود بھارتی حکومت اعتراف کرتی ہے کہ " ہر 45 منٹ کے بعد ایک عورت بے آبرو ہو جاتی ہے اور ہر 120 منٹ کے بعد ایک عورت قتل ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پوری دنیا میں خواتین کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے ترقی یافتہ ممالک میں خواتین کی حالت زیادہ دگرگوں ہے وہاں گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ خواتین کو زندگی کے عملی میدان میں بھی کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں خواتین کو زیادہ آزاد اور خود مختار سمجھا جاتا ہے وہاں خاندانی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

عورت ہر دور میں ظلم کا شکار ہوئی ہے۔ مردوں کے اس سماج میں عورت کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے باوجود وہ شدید ذہنی دباؤ' گھٹن اور جبر سے دوچار ہے۔ اس کو کم سے کم تر سمجھنے اور ثابت کرنے میں مرد نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ اور قابل کیوں نہ ہو اسے اپنی مرضی سے جینے کا حق بھی نہیں۔ کبھی والدین اور بھائیوں کی طرف سے حقوق بخشوائے گئے تو کبھی شوہر اور سسرال نے اس کا حق مارا۔ یہ خوفناک صورتحال کیسے پیدا ہوئی ؟ اسی کی تجزیہ نگاروں نے کئی وجوہ بتائیں جن میں معاشرتی گھٹن' بے جا پابندیاں' خاندان اور برادری کے جھگڑے' زمین' جائیداد اور رشتوں کے تنازعات شامل ہیں۔

اس جدید دور میں جب کہ تعلیمی شرح میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے عورت کی بیداری اور ترقی کو پورے معاشرے کی ترقی سمجھنا چاہئے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو عورت کی عزت کرتی ہیں وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کرتیں جو عورت کی عزت نہ کریں۔ 8 مارچ ہر سال خواتین کا عالمی دن اس خواہش اور امید پر منایا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں خواتین کو مجموعی طور پر درپیش مسائل میں کمی کی جائے اور ن

کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنایا جائے لیکن دیگر قومی تہواروں کی طرح یہ بھی رسمی کاروائی کی نظر ہو جاتا ہے۔ بات نشستندو گفتندو برخاستند سے آگے نہیں بڑھتی۔

ہر معاشرے میں "سوشل سسٹم" میں مردوں کو حاکیت سیاسی' معاشی' قانونی اور نظریاتی اداروں سے حاصل ہوتی ہے۔ مردوں کے کنٹرول سے چھٹکارا جس میں جبری جنسی تشدد بھی شامل ہے' اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ اس وقت جب پوری دنیا اکیسوی صدی میں باوقار انداز سے داخل ہو چکی ہے' ساری دنیا میں بسنے والی خواتین خصوصا" پاکستانی خواتین کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے ہمیں اپنے رویوں اور کردار کو بہتر بنانا ہو گا تاکہ گاڑی کا یہ دوسرا پہیہ مردوں کے شانہ بشانہ باوقار انداز میں زندگی کا سفر طے کر سکے اس کے لئے ہمیں اپنے ہم خیال مردوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے' تاکہ ہم باوقار انداز سے اکیسویں صدی میں داخل ہو سکیں۔

نوٹ :۔ ہم اپنی بیٹی کے رشحات قلم سے اتفاق کرتے ہوئے اسے اپنے مسائل کا حل اللہ کی کتاب عظیم قرآن مجید سے تلاش کرنے کی دعوت دیں گے۔ ہمیں امید ہے طلوع اسلام کا شائع کردہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ "عورت قرآن کے آئینہ میں" پڑھ کر ہماری بیٹی کو احساس ہو جائے گا کہ خالق کائنات نے عورت کو کیا مقام دیا ہے اور معاشرے میں اس کے کیا حقوق و فرائض ہیں۔ مدیر طلوع اسلام

● ● ●

☆ زر شرکت ☆

ماہنامہ طلوع اسلام کا زر شرکت آپ نے یقیناً" ارسال کر دیا ہو گا۔ پھر بھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟

جس تاریخ تک آپ کا زر شرکت ہمیں موصول ہوا ہے اس کا اندراج آپ کے ایڈریس کے اوپر والی سطر میں کر دیا گیا ہے۔ اس میں غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔

سرکولیشن آفیسر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک خط ایک جواب

خط بنام محمد ارشاد صاحب -- جواب بنام محمد اکرم صاحب

محترم ارشاد صاحب

السلام علیکم

آپ سے غائبانہ تعارف علامہ غلام احمد پرویزؒ کے ذریعے ہوا۔

ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں اور اس گزارش کا مقصد آپ کو تصوف کا قائل کرنا نہیں' بلکہ صرف اس جذبے کے تحت کہ اگر ایک انسان کی صحیح رہنمائی ہو جائے تو میرے نزدیک یہ نیکی ہی نہیں بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

میں نے خود پرویزؒ صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کچھ نہ کچھ کیا ہے۔ ماہنامہ "طلوع اسلام" ایک عرصہ تک میرے زیر مطالعہ رہا ہے' جس کی بنیاد پر میں پرویزؒ صاحب کے خیالات اور نظریات سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس واقفیت کے ساتھ ساتھ کافی حد تک ان کا قائل ہوں۔

اسلام اور معاشرے کا جو نقشہ پرویز صاحب نے پیش کیا ہے یہ بالکل درست ہے۔ اگر ان سے اختلاف ہے تو وہ صرف یہ کہ انہوں نے اسلام کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خالص مادی نقطہ نگاہ سے پیش کیا ہے جس میں ظاہری دلکشی بہت ہے لیکن صورت حال کچھ اسی طرح بھی ہے کہ قرآن ہمیں صرف مادی ترقی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ بیک وقت مادی' اخلاقی اور روحانی ترقی کی تعلیم دیتاہے اور اس پر قرآن کریم اور جناب رسالتماب کے واضح ارشادات موجود ہیں۔

تصوف ہمارے نزدیک اخلاقی اور روحانی ترقی کا ہی تو ذریعہ ہے۔ اگر موجودہ دور کے پیروں' گدی نشینوں' صاحبزادوں یا سجادہ نشینوں نے اس میں خرابیاں پیدا کر دی ہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سرے سے اس کا انکار ہی کر دیا جائے۔

دوسری طرف پرویزؒ صاحب میں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے وہ ارشادات نقل کرتے ہیں جو خود ان کے اپنے مسلک' خیالات اور نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں کا قرآن کریم یا احادیث نبویؐ کا وسیع مطالعہ نہیں ہوتا' ان پر یہ یک طرفہ کاروائی اثر چھوڑ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ صرف اسی بات کو لے لیں کہ پرویزؒ صاحب علامہ اقبالؒ کے کس حد تک قائل ہیں۔

اپنی تحریروں میں وہ انکے وہ ارشادات نقل نہیں کرتے جو خود ان کے اپنے خیالات اور نظریات کے خلاف ہیں۔ مثلاً" علامہ صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ بات آپ کی سمجھ میں بھی آ سکتی ہے کہ خرد مقام عقل ہے اور کتابی علم کا تعلق عقل کے ساتھ ہے قلب اور روح کے ساتھ نہیں۔ اور نظر کچھ اور شے ہے جس کا تعلق عقل اور علم سے نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کی وضاحت خود ہی کر دی ہے۔

نظر وہ نہیں جو سرخ و سفید کو پہچانے
نظر وہ ہے جو محتاج مہر و ماہ نہیں

اور یہی وہ چیز ہے جس کا منبع و سرچشمہ، عقل و علم نہیں بلکہ روح ہے۔ اور تصوف اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

محمد اکرم

● ● ●

سوال آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب ارشاد صاحب کا جواب دیکھئے۔

محترم محمد اکرم صاحب

السلام و علیکم!

آپ غائبانہ تعارف کو بکمال جرات مراسلات کی حد تک لے آئے۔ اس کے لئے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ خاص کر آپ کا یہ جذبہ کہ نیکی اور اللہ کی رضا مقصود ہے یقیناً" نا قابل فراموش اور قابل قدر افزائی ہے۔

آپ کے گرامی نامے کا جواب درج ذیل ہے۔

1۔ آپ کا گرامی نامہ تضادات کا مظہر ہے۔ مثلاً"

" میں پرویزؒ صاحب کے خیالات اور نظریات سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس واقفیت کے ساتھ کافی حد تک ان کا قائل بھی ہوں کہ اسلام اور معاشرے کا جو نقشہ پرویزؒ صاحب نے پیش کیا ہے یہ بالکل درست ہے"۔

2۔ " اگر ان سے اختلاف ہے تو وہ صرف یہ کہ انہوں نے اسلام کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خالص مادی نقطہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ "

میں نے بڑی دیانتداری اور توجہ سے ان دونوں جملوں کو بار بار پڑھا۔ مجھے تو ان دونوں میں واضح تضاد نظر آیا۔ آپ بھی غور فرمائیں۔ شاید یہ تضاد آپ خود بھی محسوس کر لیں۔

جناب من! آپ ماؤزے تنگ کے چین کے متعلق تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے خالص مادی نقطہ نگاہ پیش کیا

ہے۔ جو شخص قرآن پاک کے دامن کو چھوڑنا تک نہیں چاہتا' اسے یہ کہنا کہ ترقی کے متعلق اس کا نظریہ مادی ہے۔ کتنی بڑی بے باکی اور جسارت ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ کمیونزم + قرآن = اسلام اور آپ اپنے زمانے کے ایک فرد کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے اسلام کا مادی نقطہ نگاہ پیش کیا ہے۔ اسلام اور مادیت یا للعجب!

حضورؐ! قرآن کریم انسانی ہمدردی اور محنت کا جو پروگرام دیتا ہے وہ فی الواقع بے نظیر ترقی کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اسے مادی/ روحانی کی الجھن میں آپ کیسے لے آئے۔ اخلاق عالیہ کی کون سی تعلیم کی جناب پرویزؒ نے نفی کی ہے یا اسے نظر انداز کیا ہے۔ کیا پورے قرآن پر عمل پیرا ہونا روحانیت نہیں؟

شاہ افغانستان نے حضرت علامہ اقبالؒ سید سلیمان ندوی اور سرراس مسعود کو دعوت دی کہ وہ افغانستان کے لئے نصاب تعلیم مرتب کریں۔ جب وہ مرتب کر کے پیش کیا گیا تو اس میں صرف 30 فیصد دینی اور 70 فیصد دنیاوی تعلیم تھی۔ کابل کے علماء حضرات اس پر معترض ہوئے جس پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو سائنس اور دیگر دنیاوی علوم کی تحصیل کے لئے زیادہ وقت دیا جائے کیونکہ وہ اس میں بہت پیچھے ہیں۔ کیا یہ اقبالؒ کا مادی نقطہ نگاہ تھا اور آپ کے نزدیک قابل مذمت ہو گا۔

قرآن کریم بھوک' بیماری اور خوف کو اللہ کا عذاب کہہ کر پکارتا ہے۔ کیا یہ اللہ اللہ کہنے والے بھوکے' پیاسے' بیمار اور ایٹم بم کے خوف سے لرزاں مسلمان ہی صاحب روحانیت ہوں گے۔

قرآن کریم اخلاقی اور مادی ترقی کی جس معراج پر انسان کو لے جانا چاہتا ہے اس کا کچھ چربہ اہل مغرب سامنے لائے' جس کو آج کے مسلمان آئندہ سو سال تک بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ انہیں مادی ترقی سے نفرت ہے۔

ہمارے دیہات میں دودھ اتنا عام تھا کہ دودھ کی نہریں رواں تھیں۔ آج چائے کے لئے دودھ میسر نہیں۔ اس کا حل ہم سے نہ ہو سکا۔ (امریکن) آئے اور انہوں نے ہمیں لاہور میں دودھ کی منصوبہ بندی کا پروگرام دیا' گائیں لائی گئیں' فارم کے قیام کے بعد اہل لاہور کو دودھ ملنے لگا ہے۔ اگر یہی بات کوئی پاکستانی کہہ دیتا تو مادی ترقی کا کافر خطاب پاتا۔

• غالباً پرویز صاحب کے نظریات (آپ کے قول کے مطابق مادی) ہم اس وقت قبول کریں گے جب کوئی دوسری قوم (امریکہ' کینڈا' جرمنی) ان کو اپنائے گی؟

آپ کا تیسرا ارشاد یوں ہے

3- تصوف ہمارے نزدیک ایک اخلاقی اور روحانی ترقی کا ہی تو ذریعہ ہے۔ یہاں تصوف کی جگہ قرآن کریم لکھ دیں تو ہم متفق ہیں۔ آخر آپ کو اس سے انکار کیوں ہے۔ جب کہ آپ خود فرماتے ہیں کہ۔

4- " اگر موجودہ دور کے پیروں' گدی نشینوں' صاجزادوں یا سجادہ نشینوں نے اس میں خرابیاں

پیدا کر دی ہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کا انکار ہی کر دیا جائے۔ "
جب ایک شعبہ کے ذمہ دار غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کریں تو ان سے ذمہ داری کی توقع کس سے کی جائے۔

5۔ آپ نے اہل نظر کی بات کی ہے۔
علامہ اقبالؒ اہل نظر تھے۔ ان کی نگہ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ ان کی بات درست نکلی۔
آپ کے اہل تصوف (اہل نظر) فرمائیں۔
1۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق انہوں نے قوم کو کبھی کچھ نہ بتایا۔
2۔ کسی اہل نظر کو پاکستان دو ٹکڑے ہوتا نظر نہ آیا۔ اور کسی نے بروقت وارننگ نہ دی۔ آخر اس ملک میں کوئی بھی اہل نظر نہ تھا۔
3۔ اہل نظر صرف اللہ کی صفات کا ورد وظیفہ' ہی کرتے رہتے ہیں۔ **اللہ الصمد' یا رزاق' یا لطیف' یا خبیر' یا بصیر'** اور دیگر چلہ کشی وغیرہ۔

جراُت عرض معاف ! اسی قرآن کریم میں ہے کہ جو سودی کاروبار کرتے ہیں انہوں نے گویا اللہ و رسول کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔

پاکستان میں سودی کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے۔ یعنی اللہ و رسول کے خلاف اعلان جنگ موجود ہے۔ کیا آپ کے اہل نظر اصحاب کو اس کی خبر نہیں۔ انہوں نے اس کی روک تھام کے لئے کیا کیا ہے؟

اے کاش ! اگر پاکستان کی تمام گدیوں والے معہ مریدوں کے ایک بار ہی یوم احتجاج منا لیتے کہ سودی کاروبار بند کرو تو اس کا کتنا اثر ہوتا ! قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یہ اہل نظر اتنے بڑے اعلان جنگ کی جراٗت نہیں کر سکے تو اور کیا کریں گے۔

میرے دوست ! اگر یہ حضرات' اہل نظر ہوتے تو سودی کاروبار بند ہو چکا ہوتا۔ اگر ہزاروں گدیوں والے معہ مرید حضرات کے ایک بار اعلان کر دیں کہ چھ ماہ کے اندر اندر ملک سے سودی کاروبار بند کر دیا جائے تو آپ دیکھیں کہ بند ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن ان اہل نظر کو عینک کون لگائے کیونکہ وہ تو سود خور امیروں سے جیب خرچ اور لنگر خرچ وصول کرتے ہیں۔

جناب ! بے شک ہمارا علاج نظر کے سوا کچھ نہیں۔

آج ہم میں محترم پرویزؒ صاحب اہل نظر ہیں۔ وہ مسلم ممالک کو مادی ترقی کے لحاظ سے اہل مغرب سے بھی آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن حدود اللہ کے اندر رہ کر۔ وہ دنیائے اسلام کو سیسہ پلائی دیوار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ سائنس میں مسلمانوں کو تسخیر کائنات کے اس مقام تک لے جانا چاہتے ہیں جو قرآن کا منشاء ہے۔ لیکن قوم آج تک یہ کیوں نہ کر سکی ؟ یہ ایک اہل نظر علامہ اقبالؒ کی زبانی سنئے۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خور و والی و ملا و پیر
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری

پرویز صاحبؒ نے اور کچھ نہیں تو وہ نظام پیش کیا ہے جو انسانوں کے لئے رزق حلال کے اہتمام کا واضح اور دو ٹوک طریقہ کار ہے۔ اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ رزق حلال کے بغیر اسلام کا کوئی تصور موجود نہیں۔ عارف روحی کا یہ شعر تو آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔

عشق و رقت آید از نان حلال جذب و مستی نہ آید از نان حلال

آخر میں میں اپنے خط کو جناب پرویز صاحب کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

" اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کی حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی' صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی " روحانی ترقی " نہیں سمجھ لینی چاہئے جو انسان کو ارض و سماء سے آگے لے جانا تو ایک طرف' اسے خود اس دنیا میں سر بریزی اور زیردستی سکھاتی ہے۔ اس سلطان سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سر کچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً" غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام **اقطار السموت والارض** سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے یا اس سے آگے کیوں نہ نکل جائے وہ اقطار اسموات والارض کے اندر ہی رہے گا۔ ان حدود سے باہر' انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سلطان پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ (لغات القرآن صفحہ 891)

آخر میں ایک بار پھر آپ کی اس اولیت خط و کتابت کا ممنون ہوں۔ اگر آپ کے جذبات کے خلاف کوئی بات تحریر ہو گی ہو تو وہ علمی ہو گی۔ میں نے خاص کر آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنے عقیدے کی قربانی اور اپنے عقیدے کے خلاف تحقیق کا کام کرنا ہے۔ باقی سب کام آسان ہیں۔

کیا میں جواب کی توقع رکھوں!

اللہ حافظ

مخلص
محمد ارشاد ٹیچر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ رحمت اللہ طارق

وادی نمل کی ہشیار ملکہ

(" وادی نمل کی ہشیار ملکہ " کے عنوان سے علامہ رحمت اللہ طارق صاحب کا تحقیقی مقالہ مجلّہ طلوع اسلام اگست، ستمبر، اکتوبر 1996ء میں شائع ہوا تھا، جس پر ملک کے طول و عرض سے تبریک و تحسین کے پیغامات موصول ہوئے۔ اس موضوع پر " مقطع کا بند " جناب عبداللہ ثانی صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔ یہ مضامین ماہنامہ اشراق کی طرف سے اٹھائے گئے نقاط کی روشنی میں لکھے گئے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ دوسرے اہل علم کی طرح ارباب اشراق بھی اس سے مطمئن ہو گئے ہونگے لیکن اپنی حالیہ اشاعت میں ماہنامہ اشراق نے خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ اس داستان میں " اسم نسبت " کا استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے " **نملة** " سے مراد چیونٹی ہی لیا جائے گا۔ ہم اس موضوع کو اپنے ہاں تمام کر چکے تھے لیکن ماہنامہ اشراق نے چونکہ وضاحت مزید چاہی ہے اس لئے علامہ رحمت اللہ طارق صاحب ہی کے الفاظ میں وضاحت حاضر ہے۔ مدیر مسول)

انسان فطرتاً جدت پسند اور اس کی فکر ہر لمحہ اور ہر آن ارتقا پذیر ہے۔ وہ جب تک کسی چیز کی حقیقت اور کنہ تک نہیں پہنچتا رسائی حاصل کرنے کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ ایسے میں اسے مذہبی لب و لہجہ میں مطعون کرنا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ دنیا جانتی ہے کہ سائنس کی ترقی اور اثری اکتشافات نے ہمارے عقائدی نظام کو ہلا کر رکھ دیا اور اس حقیقت کو مبرہن کر دیا ہے کہ جس چیز میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ جزو عقیدہ نہیں بن سکتی۔ پہلے کا انسان کسی خاص فکر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی سوچ پر کاربند رہنے کو معراج کمال سمجھتا تھا جب کہ ماضی قریب اور حال کا فرزندِ آدم مختلف زاویوں سے اپنی سوچ و فکر کے دائرے کو وسیع کر چکا ہے۔ پہلے کا انسان آدم کو مشخص و متعارف انسان سمجھتا رہا تھا مگر تازہ سوچ نے ماضی کے اس فیصلے کو غلط ٹھہرایا ہے۔ اب وہ آدم کو نوع انسان کا ایک تمثیلی کردار ٹھہراتا اور استدلال میں مسلمان مفکرین ابو العلا المعری (1058ء) امام باقر (732ء) امام جعفر (765ء) محمد عبدہ (1905ء)، رشید رضا (1935ء)، اور ابن عربی (1240ء)، و دیگر حوالے سے بات کر کے اپنے مدعا کو زیادہ مدلل انداز سے پیش کرتا ہے۔ اس طرح اقوام سابقہ میں " نمل " کا لفظ ہے جس کے لئے قرآن حکیم نے تمام تر انسانوں کے **صیغے** استعمال کر کے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح نمایاں کیا ہے کہ نمل چیونٹی نہیں جزیرہ العرب کے بعض قبائل کا نام ہے یا نام کی مناسبت سے " **علم** " کہدیجئے۔۔۔ بلکہ اب تو یہ بھی ہو رہا ہے کہ فقہ حنفی کو روشن خیالی کی ڈگر پر چلانے والے ہمارے ناقدین ذی وقار خود بھی زید و زینب کے قرآنی ناموں کو حقیقی نام تسلیم نہیں کرتے۔ دونوں کو بیت النبی صلے اللہ علیہ وسلم کا فرضی کردار کہتے ہیں جس سے قرآن کے پورے واقعے کی بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے باوصف ان لوگوں کو مطعون نہیں کیا جاتا کہ

ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ادارہ ہے، وسائل ہیں، حلقہ سامعین ہے، اپنے مفہوم کو مدلل بنانے کی صلاحیت ہے اور انہیں الفاظ کی جادوگری سے لوگوں کو متأثر کرنے کی توانائی حاصل ہے۔

وجہ شکایت یہ ہے کہ راقم الحروف نے عرصہ 39 سال پہلے ایک مضمون بعنوان "وادی نمل کی ہشیار ملکہ" شائع کیا تھا جس پر ایک صاحب علم مگر سوچ و فکر سے عاری قلم کار نے کچھ اعتراضات جڑ دیئے جس پر راقم نے از سر نو محنت کر کے ان ہی دنوں تمام اعتراضات کے بالاستیعاب جوابات پیش کر دیئے۔ اس طرح میں فخریتا" کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کی تفسیری تاریخ میں میرا مضمون ناگزیر اضافہ ثابت ہوا جس سے اچنبہ پرستوں کے گھروندے مسمار ہو کر رہ گئے مگر چشم حسد نے طویل عرصہ کے بعد پھر سے میری طرف گھورنا شروع کر دیا اور باوصفے کہ میری نہ زبان غیر علمی تھی، نہ انداز بیان غیر شائستہ، اس پر بھی انہوں نے انداز تنقیدی ایسا اختیار کیا جیسے میں نے انہیں ہی مخاطب کر کے ہدف ملامت بنایا ہو۔۔ وہ فرماتے ہیں۔۔۔ " دوسری طرف ہمارے نزدیک قرآن مجید پر ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس کے لفظ لفظ کے آگے سر تسلیم خم رہے اس کے الفاظ سے انحراف یا ان کی من مانی تاویل در حقیقت قرآن مجید کا انکار ہے" (اشراق بابت ... 97ء صفحہ 65)

یہاں ناقد محترم نے قرآن فہمی پر نہ صرف اپنا اجارہ قائم کیا ہے بلکہ الفاظ کی " چبھن " بتا رہی ہے کہ وہ مصنف کو ظاہر الفاظ کا منکر اور اسی اساس پر منحرف بھی تسلیم کرتے ہیں حالانکہ میں نے ملکہ نمل کے واقعات و حالات سے نہ تو انکار کیا ہے نہ ہی توجیہات و تاویلات کے پٹ کھول کر الفاظ اور مزاج وحی سے انحراف کیا ہے۔۔۔ یہ الفاظ اگر کوئی بنیاد پرست کہتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ان کا انداز گفتگو ہی ایسا ہے انہیں تو انسانوں کی زبان میں بات کرنا آتا ہی نہیں ہے لیکن ان سے ہم کہیں تو کیا کہیں۔ خاص کر یہاں " افتاد " یہ ہے کہ ان کی " جدیدیت " تو تعبیر و توجیہ کا علمی انداز کہلاتی ہے لیکن ہماری جدیدیت تاویل و تحریف کا بے خطا نمونہ۔۔۔ کیونکہ وہ الفاظ کے خوبصورت اجسام تراشنے کی مہارت اور تشریح کے ساحرانہ لہجے میں لوگوں کو مبہوت و حیرت زدہ بنا ڈالنے کی سکت رکھتے ہیں۔ نمونہ کے لئے زید و زینب کے نام سے فرضی کرداروں کے واقعات ملاحظہ ہوں۔

یہ لوگ بعض اعلام فکر اسلامی کو اس انداز سے متعارف کراتے ہیں جیسے وہ ان کے سرپرست اور مربی ہوں۔ رئیس المفسرین امام فراہی بلاشبہ عظیم انسان تھے۔ وہ سب اہل فکر کی مشترکہ میراث تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ لوگ اجارہ داری کی اساس پر ان کے بھی مجاور بن بیٹھے ہیں حالانکہ میں نے 45ء میں علامہ فراہی کی نظام القرآن کے بعض اجزاء کلکتہ کے ایک کتب خانے میں مطالعہ کئے تھے۔ طیرا' ابابیل' کی تشریح میں ان کے جواہر پارے دیکھے تھے جو منفرد بھی تھے اور مدلل بھی۔ ایسے عظیم مفکر کو اپنی سطح پر یا اپنی صف میں لے آنا کتنی ستم ظریفی ہے۔ اس تلخ نوائی کا پس منظر یہ ہے کہ میرا وہی پرانا مضمون وقتی تقاضوں کے مطابق کسی طرح طلوع اسلام میں چھپ گیا اور ناقدین ذی احترام اسے اپنا جواب سمجھ کر بنیاد پرستوں کی طرح کھلے بندوں دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی بجائے " در حقیقت قرآن مجید سے انکار" کے شکر چڑھے

(Sugar Coated) الفاظ میں اپنا کام کر گئے یعنی رومال میں لپیٹ کردار کر گئے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ خود بھی الفاظ اور مزاج قرآن سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے تاہم ان پر طنز کرنا علمی رواداری کے خلاف ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تحقیق و تفتیش کے باوجود آج بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ "تحویل قبلہ" کا واقعہ سچ اور حقیقت ہے مگر یہ نہیں بتلاتے کہ اسلام کی سب سے پہلی مسجد "قبا" میں تعمیر ہوئی پھر مسجد نبوی "مدینہ طیبہ" کی زینت بنی لیکن تاریخ اور مشاہدے کی گواہی یہ ہے کہ ان مساجد میں صرف جنوب (سمت کعبہ) کی طرف محراب یا محراب کا کوئی متبادل رکھا گیا۔ شمال یا بیت المقدس کی سمت نہ محراب بنا نہ ہی شمال کی جانب برش یا کسی اور چیز سے علامتی نشان لگا کر دوسرے **قبلے** کی نشاندہی کی گئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے بھول کر بھی سمت کعبہ کو نہ چھوڑا نہ بدلا۔ بلکہ قرآن بھی کہتا ہے **وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ** آپؐ اس کے مجاز ہی نہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ وحدت کے رمزی نشان کو چھوڑ کر ان کے قبلہ کا رخ کریں (بقرہ 145) لیکن پھر کیا ہوا کہ "**قبلتین**" کے عنوان سے ایک مسجد وجود میں لائی جاتی ہے اور پہلے سے دکھلایا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ 16 ماہ تک بیت المقدس ہی کی طرف علانیہ یا چھپ کر رخ کر کے نماز پڑھاتے رہے۔ کیا اس کے لئے کوئی تازہ حکم مل چکا تھا؟ پھر کہاں ہے' وہ حکم؟ کیا اس کے لئے آپؐ نے کسی اجتہاد سے کام لیا تھا؟ اجتہاد بھی وہاں ہی کارگر ہو سکتا ہے جہاں قرآن خاموش ہو جب کہ یہاں قرآن تنبیہ کر رہا ہے کہ **وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ** ایسے میں یہ واقعہ تاریخ اسلام کا حصہ بن گیا تو کیونکر؟ اور تحویل قبلہ کے باب میں سید البشر کی شخصیت اور پالیسی کو متنازعہ بنایا گیا تو کس لئے؟

وجہ گناہ

ناظرین محترم! اگر انصاف کا بول بالا کرنا مقصود ہوتا تو میرے مقالے کا علمی جائزہ لیا جاتا اور ان حوالہ جات کی کلائی مروڑ کر مجھے دکھلایا جاتا کہ وہ توانائی کے جوہر سے بالکل عاری ہیں۔ لیکن وہ خالی دھمکی پر ٹرخا کر صرف "نسبت" کی بات کر کے پہلو تہی کر گئے حالانکہ پورے مقالہ کے مشمولات کو زیر بحث لانا چاہئے تھا تاکہ ان کے قارئین کے دوہرے اطمینان کا باعث بنتا۔ اب یہ تسلیم کہ میں نے بہت سے خارجی سہاروں کی اساس پر زاویہ نسبت کو نہیں چھیڑا لیکن اسے ہی جرم تصور کر کے وجہ گناہ اگر پوچھی گئی ہے تو آیئے وہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ گرامر لغت سے تیار ہوتا ہے اور لغت کا تمام تر ذخیرہ سماع پر منحصر ہے۔ سماع جہاں قوم کے ایک فرد کے لئے نسبت کو ضروری ٹھہراتا ہے وہاں مفہوم پر بھی نظر رکھتا ہے یعنی مفہوم اگر نسبت کو اجاگر کئے دیتا ہے تو حرف نسبت کا اظہار چنداں ضروری نہیں ہے۔

حیوان کو انسان بنانے کا طریقہ

صرف عربی ہی نہیں ہر زبان میں قرآن کو معنی آفرینی میں بڑا دخل ہوتا ہے مثلاً" عرب میں ہندوستان کی طرح جانوروں کے نام پر قبائل بنانے کا رواج عام تھا اور اس کے لئے **قال - یا - قالت** کا قرینہ کافی ہو جاتا تھا مثلاً" **ثعلب** (لومڑ) **ثعبان** (سانپ) **شارقہ** جس کے ق (ق) کو دارجہ عربی کے لہجے میں

شارجہ (مچھلی) اور ابو ظبی (ہرن) جسے غلطی سے ابو ظہبی کہا جاتا ہے۔ نمر (چیتا) اور تمساح (مگرمچھ) ان
الفاظ کے ساتھ (بنو) کا استعمال بھی ہوتا تھا جو رفتہ رفتہ تحلیل ہوتا گیا۔ اب ان کے ساتھ قال۔ یا قالت لگا
دیجئے حیوان سے انسان بن جائیں گے اور آپ " فرد" کو حرف نسبت کے اظہار کے بغیر ہی مفہوم اور قرینے
کے زور پر " بانسبت " کہہ سکتے ہیں مثلاً" **قالت ثعلبة** (بنو ثعلب کی ایک عورت نے کہا) کہنا کافی ہو گا۔
ثعلبية کہنا ضروری نہیں۔ اسی طرح **قالت ثعبانة۔ قالت شارقه۔ قالت ظبيته ۔۔ قالت نمرة**
اور قالت تمساحته ۔۔ کہنا کافی ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ آپ نسبت کے ظاہری قاعدے کے مطابق بہ
تکلف لفظوں ہی میں حرف نسبت کا اظہار کر کے فرد کو قبیلہ سے الگ کر دیں یعنی فرماویں۔ **قالت ثعلبية**
-- **ثعبانية-- شارقية۔ ظبية** (abiyyat) **نمريته** اور تماسیحتہ کیونکہ جب قالت کے قرینے اور
قبائلیت کے مفہوم نے مل کر نسبت کے زاویہ کو اجاگر کر رکھا ہے تو ایسے میں حرف نسبت کا اظہار بجائے خود
فصاحت کے منافی بھی ہو گا اور سماع کے خلاف بھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حرف نسبت کا اظہار ضروری ہو
تو کر ڈالئے لیکن جہاں ضرورت نہ ہو تو رحم فرمائیے۔

غالباً" 1955ء کی بات ہے کہ مکہ المکرمہ کی ایک علمی درسگاہ کے اساتذہ سے وادی نمل کی کہانی چھڑ
گئی میں نے ان پر واضح کیا کہ اس واقعہ کی تمام کڑیوں میں انسانی **صیغے** استعمال کے باوصف۔ نمل انسان
ہیں چیونٹیاں **نہیں**۔اس پر میں نے علامہ حسن بن احمد بن یعقوب الہمدانی (945ء) کی کتاب " **صفة**
جزیرۃ الاعرب " جسے سلطان عبدالعزیز 1952ء نے اپنے ذاتی خرچ پر چھاپا تھا اس کے صفحہ 197 پر
وضاحت دکھلائی کہ نمل۔ یمن کا ایک قبیلہ ہے جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے پھر ہمدانی ہی نے ان
بستیوں، گلی کوچوں اور صنعاء کی شہر پناہ اور دروازوں کے نام تک گنوا دیئے جہاں قبائل نملؒ رہائش پذیر
تھیں۔ مزید میں نے ہمدانی ہی کی دوسری کتاب " الاکلیل" دکھلائی جس میں قبیلہ نمل کا شجرہ نسب اس طرح
بتلایا گیا ہے نملہ بن قادم بطن من حجور بن اسلم بن علیان بن زید بن عریب بن جشم بن حاشد جس سے واضح
ہوتا ہے کہ نمل یا نملہ۔ چیونٹیاں نہیں انسانی آبادی اور قبیلہ کا نام ہے (الاکلیل طبع قاہرہ جلد 10/102)
بلکہ میں نے اپنی جستجو کو آگے بڑھا کر زمیری 1405ء کا حوالہ بھی پیش کر دیا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ
یہ نملہ بولنے والا انسان ہی تھا (**حیواۃ الحیوان طبع مصر** جلد 433/2) غرضے کہ میری ان
معروضات کو درخوراعتنا سمجھ کر سبھی نمل کے انسان ہونے کے قائل ہو گئے اور نسبت کے بارے میں فرمایا
کہ اس کے کسی فرد کے لئے نسبت کا اظہار مفہوم پر مبنی ہے۔ مفہوم اگر نسبت میں شامل ہے تو نسبت کا
اظہار غیر ضروری ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے عہد میں " سید " نے قوم، قبیلہ، اور نسبت کی حیثیت
اختیار کر لی ہے لہٰذا ہم جب " قالت سیدۃ " (Seyydat) کہیں گے تو قومیت کی نسبت اس کے اندر موجود
ہے اور معنے ہوں گے سید قوم کی ایک عورت نے کہا اور ایسے اگر بہ **تکلف** " **سیدية** "
(Seyyadiyyat) بنایا جائے تو نہ صرف مفہوم گہنا جائے گا بلکہ فصاحت کا خون بھی ہو جائے گا۔ لہٰذا ایسا بھی
ہوتا ہے کہ مفہوم کی مناسبت سے نسبت کا اظہار نہیں بھی کیا جاتا۔۔۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی ان قبائل

کا بطور نمونہ ذکر کروں گا جن کے اصل قبیلوں پر ان کا پیشہ غالب آگیا یا وہ پیشوں میں ایسے تحلیل ہو گئے کہ اصل ذات، قوم اور گوت معدوم ہو کر رہ گئے یعنی اب اگر ہم ذات کے ساتھ پیشہ لگا دیں تو وہ پیشہ نہیں ذات ہی شمار ہو گی مثلاً" خباز (تنورچی) علاف (گھاسی) لبان (دودھ دوہنے والا) سمان (گھی فروش) غسال (دھوبی) حداد (لوہار) خزار (موچی) خیاط (درزی) دھان (تیلی) غزال (سوت کاتنے والا) نساج (بننے والا) یہ سب پیشے ہیں لیکن جو لوگ ان سے متعارف ہو گئے ان کی اصل قوم نابود ہو گئی۔ حرم مکی کے ایک خطیب کا نام عبداللہ خیاط تھا لیکن خیاطی اب ان کا پیشہ نہیں ذات تھی۔ عبدالعزیز غسال' مدینہ منورہ کا بڑا سرمایہ دار تھا اور اب بھی کئی عمارات اس کی ذات سے معنون ہیں مگر وہ دھوبی نہیں۔ غسال اس کی گوت ہے۔ سرور الصبان' سعودیہ کا بڑا تاجر اور کئی اداروں کا مالک ہے مگر وہ صابون سازی نہیں کرتا۔ صبان اس کی قومی شناخت ہے۔ عبدالعزیز کعکی' سعودی عرب کا بڑا بینکار ہے۔ پوری خلیج میں مصرف الکعکی (کعکی بینک) کے نام سے اس کے بینک ہیں مگر کعکی اس کی ذات ہے وہ کیک بنانے والا بیکر نہیں ہے۔ اب ان ذاتوں کی مونثات کا ذکر ہو گا تو اصل قبیلہ کی نسبت کا اظہار نہ ہو سکے گا۔ اب فصاحت اسی کی متقاضی ہے کہ نسبت کے اظہار کے بے بغیر ہی کہا جائے۔ **قالت خبازہ-- قالت خیاطة-- قالت دھانة-- قالت غزالة --- قالت سمائة** یعنی ان کے نام کے ساتھ جونہی پیشہ کا لاحقہ ہو گا وہ قبیلہ یا ذات کا غماز ہو گا اب **خبازیة --- خیاطیة --- دھانیة-- غزالیة** کہنا ضروری نہیں۔ اسی طرح قرآن نے اگر نملہ کہا ہے اور سامع نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے تو اس کے لئے **نملیة** کا پیکر تجویز کرنا کچھ ضروری نہیں۔ کیونکہ اس وقت **نملة' نملیة** کا استعارہ متصور ہو گی۔

نمل -- پاکستان میں

نمل قبائل صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہیں پاکستان میں بھی اسی عنوان سے موجود ہیں۔ میاں والی کے شہر، تحصیلوں، قصبوں اور دیہاتوں میں لاکھوں نہیں تو ان گنت لوگ بستے ہیں جو اپنے کو نمل کہلاتے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں نمل ہی لکھا جاتا ہے بعض علاقوں میں یہ لوگ ملخ بھی کہلاتے ہیں جو دلیل ہے کہ عرب کی طرح یہاں بھی جانوروں اور حشرات کے نام پر انسان متعارف ہوتے تھے۔ ملخ فارسی میں ٹھیک نمل کا ترجمہ ہے " یعنی " (چیونٹا) مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ یہ چیونٹے ہیں سبھی جانتے ہیں کہ انسان ہیں یہ جس طرح جزیرہ العرب' شام اور مصر میں چیونٹے نہ تھے انسان تھے اسی طرح پاکستان میں بھی چیونٹے نہیں اولاد آدم ہی ہیں--- مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی توسیع سے پہلے شارع ابوذر پر **خندق الاخضر** (گرین پیلس ہوٹل) تھا اس کے قریب ایک بہت بڑی جیولری کی دکان تھی جس پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا تھا۔ " **مجو ھرات مکه** " (مکہ جیولرز) اور دوسری سطر میں تھا **لصاحبھا عبدالرحمان النمله** (پروپرائٹر عبدالرحمان نملہ) میں نے دیکھا کہ عبدالرحمان چیونٹا نہیں انسان ہے اس سے پوچھا انت انسان ام نملہ (آپ تو انسان ہیں چیونٹا کیسے بن گئے؟) اس نے فرمایا نملہ ہماری ذات ہے۔ اور پھر وہ ہنستا رہا۔

ناظرین محترم :۔ اگر علامہ فراہی اگر سید مودودی' اگر علامہ اصلاحی اگر الاستاذالغامدی نمل کو انسانی قبیلہ سے موسوم کرتے تو یقین واثق تھا کہ ناقد محترم انہیں الفاظ اور مزاج قرآن کے حوالہ سے ہرگز مطعون نہ فرماتے لیکن ان کے مقابلے میں میں ایک چھوٹا سا آدمی ہوں مجھے مطعون بتانا ان کی مجبوری تھی

والسلام

❁ ❁ ❁

اظہار تشکر!

موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے اور اپنی بات دنیا تک پہنچانے کا اہم ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ آپ میں سے اکثر احباب اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ علامہ پرویزؒ کی مطبوعات کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام نہایت ذمہ داری سے جاری ہے۔ طلوع اسلام ٹرسٹ کو اس کام کو زیادہ موثر بنانے میں جن مشکلات کا سامنا تھا ان میں سب سے اہم کمپیوٹر کا حصول تھا۔

چند ماہ قبل بزم طلوع اسلام ناروے نے ایک کمپیوٹر مستعار دیا۔ بعدازاں امریکہ سے ہمارے کرم فرما جناب محمد خان شمسی نے ٹرسٹ کے لئے ایک اعلیٰ قسم کے کمپیوٹر کی فراہمی کا وعدہ فرمایا۔ اس وعدے کو ایفا کرتے ہوئے انہوں نے ایک خطیر رقم بھجوادی جو بروقت وصول ہو گئی۔

اس کا اجر تو پروردگار ہی دے سکتا ہے ہم اپنی طرف سے ہردو اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زاہدہ درانی

ایگزیکٹو ہیڈ طلوع اسلام ٹرسٹ

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرزا ظہور الحق ۔ راولپنڈی

حضورؐ کا سفارتی نظام

حضورؐ نے فریضۂ رسالت کی بجا آوری کے لئے جن جن تدابیر سے کام لیا' ان میں اہم شعبہ حضورؐ کا وہ بنیادی طریق کار تھا جسے ہم آپؐ کا سفارتی نظام کہہ سکتے ہیں۔ المفردات راغب میں سفیر اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو بھیجنے والے کا مقصد واضح کرتا اور فریقین سے منافرت دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ "

The Encyclopaedia Americana (Americana Corporation 1961- Vol I)
میں لفظ Ambassador کے تحت لکھا ہے کہ حکومت کا نمائندہ جو کسی دوسری حکومت کے صدر مقام میں سکونت پذیر ہو۔ اس کو اپنے ملک کی طرف سے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ اہم معاملات میں دوسری حکومت سے گفت و شنید کرے۔ اس کو وہاں کے بادشاہ یا صدر مملکت سے ملاقات کا حق رہتا ہے۔

قریش کسی دوسرے عربی قبیلہ سے جنگ کرتے اور اس سے صلح کی گفتگو کرنا چاہتے تو کسی سفیر کو بھیجتے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کے سب سے آخری سفیر حضرت عمرؓ تھے جو اسلام لانے تک اس عہدے پر مامور رہے۔

رسول اللہؐ انسانی تاریخ کی وہ پہلی بین الاقوامی شخصیت ہیں جنہوں نے بین الملی۔ بین الریاستی اور بین الاقوامی تعلقات کو مرتب و منضبط فرمانے کے لئے نہ صرف جامع اصول دیئے بلکہ ان اصولوں کی بنیاد پر اس زمانے کی ہمعصر ریاستوں میں بین الاقوامی سطح پر تعلقات بھی استوار کئے۔

اس مسلمہ حقیقت سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں کہ حضورؐ کی ذات گرامی کائنات کی سب سے عظیم ہستی تھی۔ آپؐ کی بعثت عمومی تھی اور آپؐ کے ذمہ خدائی مشن کی عالمگیر دعوت کا فریضہ تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے حضورؐ نے سلاطین کے نام خطوط لکھے اور سفراء روانہ کئے۔

حضورؐ نے سلاطین کے نام جو مکتوبات ارسال فرمائے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دنیا میں کس طرح ذہنی و فکری انقلاب بپا کیا۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کیا اصول وضع فرمائے' تمدن و معاشرت کو کن راہوں پر ڈالا اور انسانیت کے فکری تقاضوں کی کس انداز سے تکمیل فرمائی کہ اس تعلیم کی بدولت دنیا کی ایک جاہل و پسماندہ قوم اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ بالغ نظر قوم بن گئی اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس میں حقوق شناسی' اور ہمدردی کے اوصاف حمیدہ بدرجہ اتم پائے جاتے تھے۔

نبی اکرمؐ نے سفراء کا انتخاب کرتے وقت ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ہر حکمران کی طرف اس ملک کی زبان جاننے والا سفیر نامزد کیا جائے اور اپنے خطوط میں جچے تلے الفاظ استعمال کئے جن میں مدعا بیان کرنے کے ساتھ اپنی اہمیت اور حیثیت کا اظہار بھی کر دیا تاکہ ان فرمانرواؤں کو یہ معلوم ہو سکے کہ انکار کرنے یا اہمیت نہ دینے کی صورت میں کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کا سفارتی مشن اعلان نبوت کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں کئی میلے اور بازار لگتے تھے جن میں دور دراز کے قبائل شامل ہوتے۔ حضور اکرمؐ ان میلوں اور بازاروں میں شامل ہو کر اللہ کا پیغام پہنچاتے۔ اہل عرب حج کے زمانہ میں ایک ماہ سوق عکاظ میں ٹھہرتے۔ پھر بیس روز تک بازار مجنہ میں قیام کرتے، وہاں سے بازار ذوالمجاز میں آتے۔ حضورؐ ان ایام میں ان کے سامنے پیغام خداوندی پیش کرتے اور انہیں بتاتے کہ "میں اللہ کی طرف سے رسول یعنی سفیر ہوں" یہ قبائل اپنی بدمستی میں حضورؐ کی طرف بہت کم توجہ دیتے۔ آپؐ نے اپنے سفارتی مشن کی تکمیل کے لئے فردا" فردا" اور اجتماعی طور پر مختلف قبائل سے سفارتی رابطہ کیا تا کہ پیغام خداوندی کی ادائیگی کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا ہو سکے۔ انہی رابطوں میں ایک اہم اور مشکل ترین سفارتی رابطہ طائف کا تھا۔ رسول مقبولؐ اہل مکہ سے مایوس ہو کر اپنے خادم حضرت زید بن حارث کی ہمراہی میں 27 شوال 10 نبوی (جنوری فروری 620ء) میں طائف کے لئے روانہ ہوئے لیکن اہل طائف نے آپ سے جو سلوک روا رکھا اس سے انہوں نے اپنے لئے جہنم میں ٹھکانا بنا لیا۔ وہاں کے ارباب اثر لوگوں نے اپنے ہاں کے گھٹیا اور بازاری لڑکوں کو حضورؐ کے پیچھے لگا دیا تاکہ حضورؐ کو ذلیل و خوار کر کے بستی سے نکال دیں۔ ان ذلیل غنڈوں نے حضورؐ پر پتھروں کی اس قدر بارش کی کہ حضورؐ کو زخمی ہو کر ایک باغ میں پناہ لینی پڑی اور جب آپؐ واپس مکہ تشریف لائے تو اہل مکہ نے آپؐ کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ابن ہشام (جلد دوئم) کے مطابق نبی اکرمؐ نے معطم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا تو وہ اپنے بیٹوں سمیت ہتھیار لگا کر حرم پہنچا اور حضورؐ کو بھی حرم میں تشریف لانے کو کہا۔ معطم حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد کو پناہ دی ہے۔ حضورؐ حرم میں تشریف لے گئے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے دولت خانہ کو واپس چلے گئے۔

مکی دور میں حضورؐ کا طریق کچھ اس طرح رہا کہ :-

1- آپؐ شہر سے باہر تشریف لے جاتے اور جو کوئی اکا دکا آدمی آپ کو ادھر سے گذرتا ہوا مل جاتا، اسے ٹھہرا کر پیغام خداوندی سناتے۔

2- جب کوئی مسافر مل جاتا اس کا اپنے ہاں قیام و طعام کا انتظام فرماتے اور دعوت حق دیتے۔

3- جب آپؐ کو علم ہو جاتا کہ شہر میں کوئی معزز آدمی آیا ہوا ہے تو خود اس کے پاس تشریف لے جاتے اور اسلام کا پیغام دیتے۔

4- مکہ کے گرد و نواح میں سالانہ میلوں میں لوگ دُور دراز سے آتے۔ آپؐ وہاں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو دین حق سے آگاہ فرماتے۔

5- مکہ کے آس پاس بستیوں۔ دیہاتوں اور قبیلوں میں تشریف لے جاتے اور اپنا سفارتی مشن پیش کرتے۔

6- حج کے زمانہ میں زیارت کعبہ کے لئے لوگ دُور دراز مقامات سے آتے۔ آپؐ ان کے ایک ایک خیمہ میں جا کر انہیں توحید ربانی سے آگاہ فرماتے۔

مکہ میں حضورؐ نے طائف کی سفارت کی کٹھن اور مشکل ترین ذمہ داری کے بعد ایک اور سفارت کا انتظام فرمایا۔ اس وقت مسلمان اس تعداد میں ہو گئے تھے کہ ان مسلمانوں میں سے چیدہ چیدہ افراد کو بطور سفیر منتخب کر کے حبشہ روانہ کیا۔ مروجہ تاریخ نے تو اس سفارت کو ہجرت کے نام سے یاد کیا ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہجرت سے زیادہ سفارت تھی کیونکہ اسمیں تاریخ ابن ہشام کے مطابق وہ خواتین و حضرات شامل تھے، جو صاحب علم، صاحب حیثیت، جری اور بہادر تھے۔ انکا تعلق نہایت معزز اور طاقتور قبائل سے تھا اور ان میں بڑے بڑے مشہور اور صاحب اقتدار لوگ شامل تھے اور پھر اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھئے کہ رسول اکرمؐ نے سفارتی مشن کی روانگی پر حضرت جعفر طیار کو شاہ حبشہ نجاشی کے نام جو مکتوب گرامی عطا فرمایا اس سے ایک تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ کی نجاشی سے واقفیت تھی اور دوسرے یہ کہ اس مکتوب گرامی کا مضمون سفارتی آداب کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اس مکتوب گرامی کے چند الفاظ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے جو میں نے ڈاکٹر محمد یونس صاحب (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی کتاب " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفارتی نظام " سے نقل کئے ہیں۔ "میں اپنے چچا زاد بھائی کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ جب یہ تمہارے پاس پہنچیں تو غرور اور تکبر کو ترک کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ میں تم کو اور تمہاری فوج کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں نے تبلیغ اور نصیحت کا فرض انجام دے دیا ہے۔ پس تم لوگ میری نصیحت قبول کرو۔ اس پر سلامتی ہو جس نے راہ راست کی پیروی کی " اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک تعارفی خط تھا۔ ابن جریر طبری کے مطابق اس سفارتی مشن نے حبشہ میں تین ماہ تک قیام کیا اور 6ھ میں نبی اکرمؐ کے حکمؐ پر واپس وطن لوٹا۔ اسی وفد کے ہمراہ نجاشی نے اپنے بیٹے کی سرکردگی میں حضورؐ کی خدمت میں ایک وفد بھیجا۔

11 نبوی میں جب بارہ افراد پر مشتمل ایک وفد یثرب سے مکہ مکرمہ آیا تو اس وفد کی درخواست پر حضورؐ نے حضرت معصبؓ بن عمیر کو بطور معلم اور سفیر مقرر کر کے وفد کے ہمراہ روانہ کیا۔ اس طرح گویا مدینہ طیبہ میں پہلی سفارت اور تعلیمی یونیورسٹی کی بنیاد پڑی۔ حضرت معصبؓ بن عمیر کی علمی اور سفارتی کاوشوں سے اگلے سال یعنی 12 نبوی میں حج کے موقعہ پر ان کی سرکردگی میں 73 مرد و خواتین کا وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ امام زیدی نے لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بارہ نقیب مقرر فرمائے ان میں تقریباً" ہر قبیلے کا ایک فرد شامل تھا۔ اس طرح گویا حضورؐ نے ہجرت سے پیشتر ہی مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ابتدائی کام کا آغاز فرما دیا۔ اب وقت اور حالات کا تقاضا تھا کہ مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ کو اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مرکز بنایا جائے۔ اس پروگرام کی تشکیل کے لئے انتظامات کی بھنک کفار قریش تک بھی پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے رسول اکرمؐ کو روکنے کے لئے پورا زور صرف کر دیا اور سرداران قریش نے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ اسلامی نظام کو روکنے کے لئے (نعوذ باللہ) حضورؐ کو قتل کر دیا جائے۔ مگر خداوند کریم نے ان کی تمام تدابیر کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ دیا اور رسولؐ اللہ بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔ اہل مدینہ نے حضورؐ اور ان کے رفقاء

کرام کا پر جوش استقبال کیا۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے اپنے نصب العین کے حصول کے لئے سفارتی کوششیں شروع کر دیں۔ قبائل کے سرداروں کے پاس اپنے نمائندے بھیجے۔ نقیب مقرر فرمائے اور ہمعصر سلاطین کے پاس اپنے سفراء کو مکتوبات گرامی دے کر روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی خارجی سفارتوں کو بھی شرف باریابی سے نوازا جن کے ساتھ مختلف معاہدات طے کئے۔ اب مسلمان چونکہ مدینہ میں ایک مرکز پر مجتمع ہو چکے تھے اور محفوظ و مامون تھے اس لئے رسول اکرمؐ کو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو منظم کر کے نظام سیاست کی تشکیل کا موقع فراہم ہوا۔ وہ نظام اس قدر مضبوط تھا کہ دس برس کے قلیل عرصہ میں تمام عرب حضورؐ کی سیادت کا دم بھرنے لگا۔ نبی اکرمؐ نے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے ہی نہیں بلکہ ہمہ گیر امن کی خاطر ایسے معاہدات کئے جن میں ہر شخص کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی گئی' اور اس طرح سیرت طیبہ کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔

حضورؐ کے پیش نظر بنی نوع انسان کی بھلائی اور خیر خواہی تھی۔ اسی بھلائی اور خیر خواہی کے جذبہ کی خاطر آپؐ نے بہت سے معاہدے کئے جن میں معاہدہ صلح حدیبیہ بھی شامل ہے۔ محترم پرویزؒ صاحب نے اس اہم اور تاریخی واقعہ کیوجہ معراج انسانیت میں نہایت مختصر مگر جامع انداز میں یوں بیان کی ہے۔ نظام قرآنی میں جو مرکزی حیثیت کعبہ کو حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے کن اضطراری حالات میں مکہ کو چھوڑا تھا۔ کعبہ چونکہ اس تمام سعی و کاوش اور جدو جہد کا ماحصل اور تمام تگ و تاز اور حرکت و عمل کا منتہیٰ تھا' اس لئے مدینہ میں آنے کے بعد بھی حضورؐ کی تمناؤں کا مرکز اور آرزوؤں کا محور رہا۔ آپؐ کا جسم یہاں' لیکن روح وہیں تھی۔ آپؐ کی نگاہ کا ہر تار اسی قبلہ مقصود سے وابستہ اور دل کی ہر جنبش اسی مرکز حیات سے ہم آہنگ تھی۔ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے خیال اسی سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لگا رہتا تھا پھر چونکہ اپنے مشن کی صداقت پر ایمان محکم اور اس کی آخری کامیابی پر یقین کامل تھا اس لئے یہ امید آپؐ کے قلبِ اطہر کی انتہائی گہرائیوں میں ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر پیوست تھی کہ ایک نہ ایک دن ہمیں پھر مکہ میں داخل ہونا ہے اور اس طرح کعبہ کو ملتِ اسلامیہ کا مرکز بن کر رہنا ہے۔ ذی القعدہ 6ھ کا ذکر ہے کہ آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے متبعین کے طائفہ مقدسہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا' لیکن عربوں میں حج حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ہی رائج تھا اور سنت ابراہیمی کے اتباع میں وہاں حج بھی کیا جاتا تھا اور عمرہ بھی۔ حضورؐ نے عمرہ کا ارادہ کیا۔ وفور شوق نے قریب چودہ سو صحابہؓ کو بھی ہمرکاب کر دیا۔ زائرین بیت اللہ کا یہ کاروان عشق و محبت' جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے رواں دواں' دیار محبوب کی جانب روانہ ہوا۔ قریش نے جب یہ سنا تو خوامخواہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگ گئے۔ حضورؐ جب مکہ سے باہر ایک منزل کے فاصلہ پر مقام حدیبیہ پہنچے تو نہایت واضح الفاظ میں قریش تک یہ پیغام بھجوا دیا کہ ہم صرف زیارت بیت اللہ کے لئے آئے ہیں۔ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہیں اور قربانی کے جانور ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسی حالت میں کوئی لڑائی نہیں لڑا کرتا۔ اس لئے مفت کی ضد نہ کرو۔ ہمیں زیارت کعبہ سے شرف یاب ہونے دو۔

لیکن ان کے سر پر قوت کا نشہ سوار تھا۔ انہوں نے جواب میں ایک دستہ فوج بھیج دیا حالانکہ اس مہینہ میں عرب لڑائی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس دستہ کو مسلمانوں نے آسانی سے گرفتار کر لیا۔ انہوں نے معافی مانگی تو اس سے ابر کرم کی گہرباریوں نے ان کے دامن امید کو خالی نہ لوٹایا اور سب کو معافی دے کر چھوڑ دیا۔ "

کفار قریش کی کوشش اور خواہش یہ تھی کہ حضورؐ اور ان کے رفقائے گرامی کسی طور پر بھی عمرہ نہ کریں۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے تو سفارتی ذرائع سے کام لیا اور اس کے لئے حضورؐ کی خدمت میں پہلی سفارت قبیلہ وزاعہ کے سردار بدیل بن ورقا کی سرکردگی میں پہنچی اور آپ کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ اور ساتھ ہی لشکر قریش کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے حضورؐ کو مکہ میں داخل نہ ہونے کی ترغیب دی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ہم صرف زیارت حرم کے لئے آئے ہیں جنگ ہمارا مقصود نہیں۔ اسی طرح قریش کی دوسری تیسری اور چوتھی سفارت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی لیکن حضورؐ اور ان کے رفقائے گرامی کے عزم راسخ کو متزلزل نہ کر سکے۔ قریش کے پے در پے سفیروں کی آمد اور واپسی کے بعد نبی اکرمؐ نے اندازہ لگایا کہ چونکہ معاملہ نا تمام رہ گیا ہے' ممکن ہے کہ قریشی سفیر واپس جا کر ان پر پوری کیفیت ظاہر نہ کرتے ہوں اس لئے حضورؐ نے پیغام صلح کے ساتھ اپنے سفیر خراش بن امیہ کو بھیجا۔ قریش نے پیغام صلح کے جواب میں ان کے اونٹ کو ہلاک کر دیا اور خراش بن امیہ نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ آخر کار حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو مذاکرات کے لئے شرفائے قریش کے پاس بھیجا اور تاکید کی کہ قریش کو سمجھائیں کہ ہم صرف عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ مکہ میں ہی تھے کہ یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کا نبیؐ کریم پر بہت اثر ہوا۔ آپ نے فوراً" اصحابہ اکرام کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ اب ہم پر حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص واجب ہو گیا ہے اس لئے اب جنگ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اصحابہ سے جانثاری کی بیعت لی۔ ابن ہشام کے مطابق حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت خود حضورؐ نے لی۔ یہ بیعت خدا سے اس بات کا عہد نامہ تھا کہ اس کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جائے گا۔ اور چونکہ رسول اللہؐ بحیثیت نمائندہ خداوندی (مرکز ملت) بیعت لے رہے تھے اس لئے حضورؐ کے ہاتھ کو قرآن نے خدا کا ہاتھ قرار دیا۔ **اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا" عَظِیۡمًا"** (48/10) (اے پیغمبر اسلام) جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں گویا کہ وہ خدا سے بیعت کر رہے ہیں (اور) خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد کو توڑے گا تو اس کے عہد کو توڑنے کا وبال اسی پر پڑیگا اور جو شخص خدا سے کیا ہوا وعدہ جہاد پورا کر دکھائے گا تو عنقریب خدا اس کو جزائے عمل کے طور پر بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ تاریخ نے اس بیعت کو بیعتِ رضوان کے نام سے محفوظ کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔ دراصل قریش نے حضرت عثمانؓ کو نظر بند کر دیا تھا لیکن بیعتِ رضوان کا فوری اثر یہ ہوا کہ قریش گھبرا گئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ رسول مقبولؐ اگر چاہتے تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر کو وجۂ جواز بنا کر بزور

مکہ میں داخل ہو جاتے کیونکہ اس وقت قریش کی فوج مکہ سے کافی دور تھی۔ لیکن چونکہ آپؐ کا مقصد امن کا قیام اور فساد و طغیان کی بیخ کنی کرنا تھا اس لئے حضورؐ نے مصالحت کو ہی پسند فرمایا۔

شروع میں اگرچہ قریش کو یہی اصرار تھا کہ مسلمان مکہ میں قدم نہیں رکھ سکتے' لیکن جب رسولؐ کی تیاری کا حال معلوم ہوا تو مرعوب ہو کر صلح کے لئے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا اور سہیل بن عمرو کو جو خطیب قریش کے نام سے مشہور تھے' اپنی جانب سے سفیر بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ دیر تک صلح کی شرائط پر گفتگو ہوتی رہی اور بڑے ردّو قدح کے بعد چند شرائط پر اتفاق ہوا۔ سرور عالمؐ نے حضرت علیؓ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا۔ جن شرائط پر صلح ہوئی' محترم پرویزؒ نے معراج انسانیت میں ان کی تفصیل یوں دی ہے "۔

1۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

2۔ آئندہ سال حج کے لئے آئیں اور صرف تین دن رہ کر چلے جائیں۔ ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔ صرف تلواریں ہوں اور وہ بھی نیام میں۔

3۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں' انہیں ساتھ نہ لے جائیں اور اگر کوئی اور مسلمان مکہ میں رہنا چاہے تو اسے اس سے روکیں نہیں۔

4۔ کفار میں سے اگر کوئی شخص مدینہ جائے تو اسے روکا نہ جائے' لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ جائے تو کفار اسے واپس نہیں کریں گے

5۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

ڈاکٹر حافظ محمد یونس نے واحدی کے حوالے سے اپنی کتاب " رسول اللہ کا سفارتی نظام" میں اس شرط کا اضافہ کیا ہے کہ " دونوں نے دس سال تک ہتھیار رکھ دینے کا عہد کیا۔" معاہدہ صلح پر مسلمانوں کی جانب سے حضرت ابو بکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ' عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت علیؓ (کاتب معاہدہ) کے دستخط ہوئے۔ اور کفار کی جانب سے متعدد آدمیوں کے دستخط ہوئے جن میں مطلب بن عبدالعزیٰ' عبداللہ بن سہیل بن عمرو وغیرہ شامل تھے۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا شرائط مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ تحریر کے وقت بھی جزئیات تک میں قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے جہاں جہاں کسی بات پر اصرار کیا' اسے مان لیا گیا۔ مثلاً" حضرت علیؓ نے شروع میں حسب معمول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو سہیل نے کہا عربوں کے دستور کے مطابق **'اسمک اللھم' لکھو** اور یہ منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد جب یہ لکھا گیا کہ یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہؐ نے تسلیم کیا ہے تو اس پر سہیل نے اعتراض کیا اور کہا کہ آپؐ کا نام محمد ابن عبداللہ ہے' وہی لکھئے کیونکہ ہم آپؐ کو رسول اللہؐ تسلیم نہیں کرتے اور یہ شرط بھی مان لی گئی۔

کبھی کبھار بڑی بڑی تحریکوں کے دوران کار ایسے نازک لمحے بھی آ جاتے ہیں کہ قائد اور اراکین وفد کے درمیان مستقبل کے معاملات کی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ذہنی فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ قیادت کی نگاہ دور رس

نتائج پر ہوتی ہے اور ارکان مشن نسبتاً" نزدیکی حقیقتوں تک سوچ سکتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع بحران کا سبب بن جاتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو سفیر قریش کا بیٹا ابو جندلؓ بیڑیاں پہنے ہوئے اس موقع پر آ پہنچا۔ کفار قریش نے اسے مار مار کر اسکا جسم لالہ زار کر دیا تھا۔ مصائب و تکلیف سے اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ کون سی آنکھ تھی جو اسے دیکھ کر اشکبار نہ ہو گئی ہو گی۔ لیکن سہیل نے کہا کہ گو ابھی معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی۔ تاہم ابو جندلؓ کو مسلمان اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ رسول اللہؐ نے کئی مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ حضورؐ نے بڑے مصالح کی خاطر اس ظالمانہ مطالبہ کو بھی قبول فرما لیا۔ ابو جندلؓ چودہ سو مسلمانوں سے فریاد کر رہے تھے کہ بھائیو! تم مجھے پھر انہی بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہو۔ ذرا میری حالت تو دیکھو! اگر تم بھی مجھے ان مصائب و الام سے نہیں بچاؤ گے تو پھر میری امداد کون کریگا۔ یہ اپیل اپنے اس ماحول میں بڑی اشتعال انگیز تھی چودہ سو فدائیوں کی پرجوش جماعت نہایت صبر آزما اور سخت امتحان میں مبتلا ہو گئی۔ ایک طرف ان کی غیرت ایمانی کہتی تھی کہ اپنے جسم کا آخری قطرہ خون بھی دینے کو تیار ہیں مگر اسلام کی اس توہین کا زخم کھانے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ دب کر مصالحت کی جائے اور ایک مسلمان کلمہ گو کو کفار کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ دوسری جانب ایمان کی روشنی عطا کرنے والے کی اطاعت شعاری اور ایفائے عہد کی ذمہ داری تھی۔ اس صورت حال میں صحابہ کرامؓ کی غیرت ایمانی اور اطاعت اسلامی کی کشمکش اور معاہدہ کے پس منظر میں اپنے مشن کی کامیابی کی بشارت حضورؐ کی نگاہ میں تھی۔ اس لئے حضورؐ نے ابو جندلؓ کو سہیل کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ ابو جندل ضبط اور تحمل سے کام لو۔ خدا تمہارے اور دوسرے مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکال دے گا۔ اب صلح ہو چکی ہے۔ ہم ان لوگوں سے بد عہدی نہیں کرنا چاہتے۔ مسلمان اس صلح سے بہت دل شکستہ اور مغموم تھے اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ اعتراف شکست تھا۔ لیکن اللہ کریم نے اس شکست کو فتح قرار دیا اور فتح بھی کھلی واضح۔ جب فرمایا (اے پیغمبر اسلام) بلا شبہ ہم نے تمہیں (صلح حدیبیہ) کے ذریعے' ایک کھلی ہوئی واضح فتح عطا فرمائی تا کہ اللہ تمہاری تمام اگلی پچھلی تدبیری کوتاہیوں کو معاف کر دے اور تمہارے لئے اپنی نعمتوں کو تمام و کمال پورا کر دے۔ اور انہیں حق و صداقت کی سیدھی راہ کی طرف راستہ دکھا دے نیز اپنی پرشکوہ مدد کے ساتھ تمہاری امداد فرمائے " (1-3/48)

محترم پرویزؒ صاحب نے اس معاہدہ صلح کے نتیجہ کو اپنی مشہور زمانہ کتاب " معراج انسانیت " میں یوں بیان کیا ہے۔ " چنانچہ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ یہ ظاہری شکست فی الواقعہ بعد کی فتوحات کے لئے کشادہ راہ تھی۔ اس وقت تک مسلمان محض اپنی حفاظت کی فکر میں تھے۔ اب اس کے بعد غلبہ تمکن کی زندگی شروع ہوئی۔ ایک عرصہ کی کشیدگی اور سلسلہ جنگ و جدال نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ خود غرض عناصر مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کے بھیانک افسانے مشہور کر دیتے تھے جس سے قریش وغیرہ کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھتے تھے۔ اس معاہدہ نے آتش مبازرت کو فرو کیا تو مخالفین نے مدینہ آنا جانا شروع کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے قریب آ کر

دیکھا کہ یہ در حقیقت ویسے نہیں جیسی ان کی تصویر کھینچی جاتی تھی اور ان کے عزائم و مقاصد وہ نہیں جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ قریب دو سال (بائیس ماہ) کے عرصہ میں جب تک یہ معاہدہ قائم رہا' لوگ مسلمانوں کی طرف کھنچتے چلے آئے۔ معاہدہ حدیبیہ کے وقت نبی اکرمؐ کی معیت میں صرف چودہ سو کی جمعیت تھی۔ اور اس کے دو سال بعد جب مکہ فتح ہوا تو آپ کی جلو میں دس ہزار کی جماعت تھی۔ اس لئے حدیبیہ کا معاہدہ جو بظاہر شکست خوردگی اور مرعوبیت کا مظہر دکھائی دیتا تھا' در حقیقت حصول مقاصد کے لئے کشادہ راہ کی صورت تھی۔ اور اسی لئے ایک فتح مبین۔ محترم موصوف نے اپنے اس نتیجہ کی تائید میں غیر مسلم مورخین کے اعتراف کا حوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے یوں پیش کیا ہے۔ معاہدہ حدیبیہ نے متحارب جماعتوں کو دم لینے کی فرصت دیدی اور اس کا فائدہ نبی اکرمؐ کو ہوا۔ یہ صلح قریب دو سال تک قائم رہی اور اس دوران میں اہل مکہ کے لئے پیہم ناکامیوں اور توقعات کے خلاف ان کے لئے باعث نقصان ثابت ہوئی۔ اور انہیں خود ہی درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدل دیا جائے۔

معاہدہ حدیبیہ سرور کونینؐ کی سیاسی زندگی کا شاہکار تھا جو بعد میں اسلام کی سربلندی کا ذریعہ ثابت ہوا۔ دیکھا جائے تو حضورؐ کی زندگی کا وہ کونسا مرحلہ ہے جو بنی نوع انسان کے لئے مشعل راہ نہ ہو۔ نظام سفارت کے یہ چند واقعات نمونہ مشتے از خروارے تو ہو سکتے ہیں لیکن اس ارفع و اعلیٰ نظام سفارت کے عکاس ہرگز نہیں کہ یہ وہ بحر ذخائر ہے کہ اس میں جو بھی غوطہ زن ہوا اسکی جھولی موتیوں سے بھر گئی۔

❁ ❁ ❁

قلمکار حضرات سے التماس

مضامین براہ کرم لائین چھوڑ کر لکھیں ایسے الفاظ جن کے غلط پڑھے جانے کا احتمال ہو انگریزی میں بھی لکھ دیں تاکہ ہجے آسانی سے پڑھے جا سکیں۔

مضمون کی قلمی کاپی ارسال فرمائیں۔ فوٹو کاپی اپنے پاس محفوظ فرمائیں۔

مضامین پانچ تاریخ تک موصول ہو جانے چاہیں۔ مدیر مسول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھتے جاتے ہیں

تشکیل پاکستان کے بعد جب یہاں قرآنی فکر کی نشرو اشاعت کے سلسلہ کا آغاز ہوا تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ یہ اللہ کا خاص کرم تھا کہ جتنی شدت سے مخالفت ابھری اتنی ہی ارزانی سے مالک حقیقی نے تحریک کو جری' بیباک اور باہمت کارکن عطا کر دیئے جنہوں نے مخالفتوں کے اس ہجوم میں جگہ جگہ قرآنی شمع جلائی اور اس کی روشنی کو پھیلاتے گئے۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے

کے مصداق سال 1996ء کا آغاز ہوا تو چک 215/EB کے جواں ہمت چوہدری عبدالحمید صاحب کا بلاوا آ گیا۔ چوہدری صاحب اگرچہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھے لیکن خاندانی وجاہت اور فکر قرآن کی لگن کے باعث اس نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو چوہدری کی گھن گرج میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بزم کا انتظام اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونہار معاون کے سپرد کر چکے تھے۔ موت آئی اور ساتھ ہو لئے۔

چوہدری صاحب کی مفارقت بھول نہ پائے تھے کہ سرگودھا بزم کے نمائندہ جناب ارشد محمود ارشد صاحب بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ زندگی کے آب گہر کی طرح شفاف' بہت ہی کم گو' آخری لمحات تک موت سے نبرد آزما رہے۔ راقم نے ایک دفعہ از راہ تفنن کہا۔ چوہدری جی کچھ کھایا پیا کرو' کہنے لگے۔ جتنا چاہے پانی دو' اپریل میں گندم ہری نہیں ہوتی۔ افسوس چوہدری صاحب بھی ہرے نہ ہوئے۔ اپنی مدت پوری کی اور چلدیئے۔

انہی دنوں اطلاع ملی کہ چوہدری فضل داد صاحب ہسپتال میں ہیں۔ یہی خبر کچھ کم دردناک نہ تھی کہ یہ اطلاع احباب پر بجلی بن کر گری کہ اقبال کے مرد مومن کا زندہ پیکر' بظاہر تندرست و توانا چک 215/EB کا دوسرا چوہدری جگر میں کینسر جیسا مہلک روگ پالے ہوئے ہے بہت چاہا کہ موت کی ہنسی اڑاتا وہ کچھ دن اور جیئے لیکن اندھی موت کا چنگل سخت گیر رہا۔ کون نہیں جانتا کہ چوہدری صاحب کلام اقبال پیش کرتے تو سامعین مسحور ہو جاتے۔ ان کی آواز رسیلی بھی تھی اور پر سوز بھی۔

ادارہ طلوع اسلام ان احباب کی کربناک جدائی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ اپنی کتاب عظیم کے ان شیدائیوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ان بزم ہائے طلوع اسلام کے غم میں بھی برابر کا شریک ہے جنہیں یکے بعد دیگرے ان صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔

چیئرمین ادارہ

● ● ●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

طلاق، حلالہ اور تھیاکریسی

تھیاکریسی سے مراد ایسا نظام حکومت ہے جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو احکام خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے۔ انہی میں سے ایک حلالہ کا قانون ہے۔ چندہ ماہ پیشتر ایک وفاقی شرعی عدالت نے اس قانون کو خلاف اسلام قرار دیا تو سارے ملک کے ارباب مذہب سراپا احتجاج بن گئے۔ بنیاد یہ بتلائی کہ یہ قرآن سے ثابت ہے حالانکہ ان کا یہ دعوی سراسر قرآن پر بہتان کے مترادف تھا۔ قرآن کے جس حوالہ کی طرف مولوی حضرات کا اشارہ ہے وہ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 230 ہے جس کا عام فہم زبان میں مفہوم یہ ہے کہ "اگر کسی میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ طلاق (اور تین مرتبہ نکاح) کے بعد تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے تو اس کے بعد یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔ ہاں البتہ اگروہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور اس سے بھی طلاق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر لے بشرطیکہ انہیں توقع ہو کہ وہ اب قانون خداوندی کی حدود کی نگہداشت کر سکیں گے۔

یہ ہیں عائلی زندگی سے متعلق وہ قوانین جنہیں اللہ ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ جو معاشرتی زندگی کی مصلحتوں کا علم رکھتے ہیں" (مفہوم القرآن پرویز)

جناب پیر کرم شاہ صاحب اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔ "(دوبارہ طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہو گی اس پر اس کے بعد، یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کیساتھ۔ پس اگروہ دوسرا طلاق دے اسے تو کوئی ہرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہوکہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی، وہ بیان کرتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

تفسیر۔ "یہاں سے تیسری طلاق اور اس کے حکم کا بیان ہے۔ یعنی اگر تیسری طلاق بھی اس نے دے دی اور اب جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے بالکل اسی طرح بسنے کی نیت سے نکاح نہ کرے جیسے اس نے پہلے خاوند کیساتھ کیا تھا اور پھر وہ دوسرا خاوند ہم بستری کرنے کے بعد کچھ مدت گزرنے کے بعد اپنی مرضی سے طلاق نہ دے دے اس وقت تک وہ پہلے خاوند کے نکاح میں نہیں جا سکتی۔ یہ ہے قرآن کا واضح ارشاد جس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ آج کل اس کا حل، حلالہ کی باعث صد نفرین صورت میں تلاش کر لیا گیا ہے۔"

اس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم پیش نظر رہے کہ "حلالہ کرنے والے پر بھی اللہ کی پھٹکار اور جس (بے غیرت) کے لئے حلالہ کیا جا رہا ہے اس پر بھی اللہ کی پھٹکار"

(تفسیر ضیاء القرآن)

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مناسب ہے کہ مزید ایک دو مفسرین کی رائے سے بھی استفادہ کر لیا جائے' لہٰذا آپ مولانا محمد شفیع صاحب کا ترجمہ اور تفسیر بھی ملاحظہ فرمالیں۔

ترجمہ "پھر اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد' جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اسکے سوا۔ پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم' اور یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی جوبیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے"

خلاصہ تفسیر۔ "پھر اگردو طلاقوں کے بعد کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق دینے) کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہو گی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کیساتھ (عدت کے بعد)نکاح نہ کرے (اور حقوق زوجیت صحبت کا ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ (آپس میں نکاح کر کے) بدستور پھر مل جاویں۔ بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خداوندی ضابطے ہیں۔ حق تعالے ان کو بیان کرتا ہے ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں" (معارف القران)

مولانا مودودی صاحب اسی آیت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں "لیکن اگر آدمی تین طلاق دے چکا ہو تو نہ عدت کے اندر رجوع ممکن ہے اور نہ عدت گذر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ اس عورت کا نکاح کسی اور شخص سے ہو۔ وہ نکاح صحیح نوعیت کا ہو' دوسرا شوہر اس عورت سے مباشرت بھی کرچکا ہو۔ پھر یا تو اسے طلاق دیدے یا مر جائے۔ اس کے بعد اگر عورت اور اس کا شوہر باہمی رضا مندی کیساتھ از سر نو نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ (تفہیم القران)

قرآن کی رو سے اب تک جو ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تین طلاق کے بعد کوئی عورت اپنے سابقہ خاوند کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔ جب تک آیت مذکور میں دی گئیں صورتیں ازخود پیدا نہیں ہو جاتیں۔ لیکن ہماری فقہ اس سے اختلاف کرتی ہے اس میں اگر ایسی صورتیں از خود پیدا نہ ہو سکیں تو وقتی اور رسمی طور پر خود نکالنا پڑتی ہیں تاکہ عورت کا نکاح اپنے سابقہ خاوند سے جائز قراردیا جا سکے۔ چنانچہ کتاب الفقہ جلد چہارم کے صفحہ 145 پر لکھا ہے:۔

"اگر ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین بار طلاق دے دی تو اب وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ کسی اور کے ساتھ شادی نہ کرے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے کی نیت کرے۔ بلکہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے گی۔ جبکہ دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ اس ارادے سے مباشرت کی کہ اسے پہلے خاوند کے لئے حلال کر دے"۔

مولانامودودی صاحب نے ایسے نکاح کو سازشی نکاح سے موسوم کیا ہے۔ یعنی جس میں پہلے سے یہ طے شدہ ہو کہ عورت سابقہ شوہر کے لئے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اس سے نکاح کرے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اسے طلاق دے دیگا۔

قارئین کرام! اس وقت تک ہم نے چند جید اور نامی گرامی علمائے کرام کا کلام ان کے اصل الفاظ میں پیش کیا ہے اور اس پر کسی رائے اور تبصرہ سے احتراز کیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سورج کے سامنے دیا جلانے والی بات ہے۔ بہرحال پھر بھی قران کی روشنی میں اگر کچھ سفر طے ہو جائے تو حرج والی بات بھی نہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ تراجم اور تفاسیر میں جو نمایاں اور باہمی فرق ہے وہ یہ کہ ترجمہ میں دوسرے خاوند کیساتھ مباشرت کا کہیں ذکر نہیں جبکہ تفاسیر میں اسے ایک لازمی اور اٹل شرط کے طور پر شامل کیا گیا ہے' جس کے جواز کے لئے سب نے ایک روایت کا سہارا لیا۔ آخر اس میں کیا مصلحت تھی؟ کیا اللہ تعالے سے ایسی شرط جو بہرحال لازمی تھی نعوذ باللہ سہوا" رہ گئی تھی۔ ایسا کہنا ہمیں دین خداوندی سے بہت دور لے جاتا ہے۔ کیا ہم یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ اللہ کا یہ دین قرآن مجید میں مکمل محفوظ ہے اور اس میں اب کسی کی زیادتی یا تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دراصل نکاح پہلی بار کیا جائے یا دوسری بار یا تیسری بار' یہ کوئی کھیل تماشہ نہیں ایک مقدس دستاویز ہے۔ اس کے لئے ایسی احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ عمر بھر کے لئے ہو اور توڑنے یا ختم کرنے کی کبھی نوبت نہ آئے۔ اس لحاظ سے ہر نکاح کی حیثیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس خاص آیت (2/230) میں دوسرے خاوند سے نکاح کے بعد مباشرت کی شرط کیوں لازمی بن گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی کڑی شرائط نے ہی فقہ میں سازشی نکاحوں کے در کھولے ہیں اور انسانوں کے وضع کردہ یہ رسوا کن قوانین اب احکام خداوندی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں' جن میں تبدیلی ناممکن خیال کی جاتی ہے۔

مزید برآں کوئی سازشی نکاح کا حامی ہو یا مخالف ایسا معلوم ہوتا ہے اس حمام میں سب ننگے ہیں اور اس کالے قانون (حلالہ) کے خلاف آواز اٹھانے میں کوئی بھی مخلص نہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں چند ماہ پیشتر جب وفاقی شرعی عدالت کے مسٹر جسٹس شفیع محمدی نے اپنے ایک فیصلے میں حلالہ کو خلاف اسلام قرار دیا تو تمام مذہبی لابی ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی' یہاں تک کہ سازشی نکاح کے مخالفوں میں سے بھی کوئی مائی کا لال شرعی عدالت کی تائید میں سامنے نہ آیا۔ مولانا مودودی صاحب جنہوں نے حلالہ کی مخالفت میں سازشی نکاح کی اصطلاح وضع کی' کا کوئی جانشین (موجودہ امیر جماعت) بھی مودودی صاحب کی تفسیر کے حوالے سے یہ نہ کہہ سکا کہ طلاق اور حلالہ پر جسٹس شفیع محمدی کا فیصلہ درست ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مسٹر جسٹس شفیع محمدی نے خود روزنامہ پاکستان مورخہ 20/8/96 میں اپنے ایک انٹرویو میں کیا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ملک میں مذہبی جماعتوں کو زیادہ پذیرائی کیوں حاصل نہیں ہوئی' جس کا ثبوت ملک میں ہونے والے انتخابات کے نتائج ہیں۔ جوابا" جسٹس صاحب نے فرمایا کہ "بات وہی ہے' عوام کی فرسٹریشن۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کس کا ساتھ دیں۔ اسلام کو اپنے مفاد کے لئے تو استعمال کیا جا رہا ہے لیکن اسلام کو اسلام کی خاطر استعمال نہیں کیا جا رہا۔ ورنہ اگر جماعت اسلامی مخلص ہوتی تو وہ مولانا مودودی کی تفسیر لا کر کہتے کہ طلاق اور حلالہ پر شفیع محمدی کا فیصلہ درست ہے"

قارئین کرام! ہمارے واعظین اور مذہبی علماء کی طرف سے عموما" کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو احترام و مقام عطا کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں

اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ درست ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں لیکن جہاں تک طلاق کا تعلق ہے ہمارے مروجہ اسلام میں اس کا اختیار مرد کو ہی حاصل ہے اور جس میں بیک وقت تین طلاقوں کو بھی جائز تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان حالات کے تحت جو بہرصورت خلاف اسلام اور انسانوں کے وضع کردہ قوانین سے ہی پیدا ہوئے ہیں' بے چاری عورت کسی وقت بھی بڑی گھمبیر صورتحال سے دوچار ہو سکتی ہے۔ مثلاً" خدانخواستہ اگر مرد کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کے تحت کھڑے کھڑے اپنا آزاد اختیار استعمال کر لیتا ہے' تو اچانک پیدا ہونے والی صورتحال کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ بچوں والی بے گناہ عورت اگر پوری نہیں تو نیم پاگل ضرور ہو جائے گی۔ پل بھر میں گھر کی بربادی' بچوں سے جدائی کا صدمہ' بہن بھائیوں اور دیگر جاننے والوں میں رسوائی' سب ایسے عوامل ہیں جو قیامت سے کم نہیں ہوتے۔ ایسے میں مذہب کی کمین گاہ سے آواز آتی ہے کہ اب حلالہ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تو قارئین کرام! ان حالات میں اگر ماں کی ممتا مذہبی بربریت کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو تعجب کی کونسی بات ہے۔ لیکن اس گئے گذرے زمانے میں بھی غیرت کی پیکر اور شرم و حیا میں ملبوس ایسی بیبیوں کی بھی کمی نہیں جو مریم کی طرح خانقاہی روایات کو توڑ کر اپنا رستہ خود بنا لیتی ہیں۔ انہی میں سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک جرات مند مقامی خاتون بشیراں بی بی بھی شامل ہے' جس کی داد فریاد جب اسلام کے کسی اجارہ دار نے نہ سنی تو اس نے تھیاکریسی سے بغاوت کر کے سابقہ خاوند اور مولوی کو عدالت میں چیلنج کر دیا۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلوں ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

اصل واقعے کے لئے ایک اخباری خبر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں "ٹوبہ ٹیک سنگھ (ڈسٹرکٹ رپورٹر) "جج صاحب! مجھے مولوی کے حلالہ سے خوف آتا ہے" یہ بات ایک مقامی خاتون بشیراں بی بی نے اپنے سابقہ خاوند شفیع کے خلاف دائر دعوے میں کہی ہے۔ بشیراں بی بی نے مزید کہا کہ اس کا خاوند اسے باجی کہہ کر پکارا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس نے اپنے خاوند سے طلاق لی ہوئی ہے لیکن طلاق کے باوجود سابقہ خاوند اسے مولوی حلالہ کے سپرد کر دینے کی دھمکیاں دیکر ڈرا دھمکا رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی لیکن مولوی حلالہ کے پاس نہیں جاؤں گی (روزنامہ پاکستان لاہور مورخہ 27/7/96)

کون بڑھائے حوصلے کون بندھائے دھیر
سب ہاتھوں میں خون ہے سب آنکھوں میں نیر

اور حقیقت یہی ہے کہ تھیاکریسی کے اس نظام حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جس جہنم میں مبتلا ہے' اس کے تصور تک سے (ہمارا آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز خاں تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے نوع انسان کی تاریخ میں تھیاکریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم ان بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

اب ایسے دور کو واپس نہ لاؤ بہر خدا
گنے گئے تھے سلاطیں بھی جب خداؤں میں

⁂

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے' لیکن اس کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ انسانی ذہن اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا دائرہ دنیاوی زندگی تک محدود ہے۔

اس کا جواب قرآن مجید ہی دے سکتا ہے

کیونکہ وہ اس خدا کی کتاب ہے جو عالم الغیب والشھادۃ ہے لیکن قرآن مجید کے ان حقائق کو سمجھنے کے لئے بڑے وسیع علم اور گہرے فکر کی ضرورت ہے!

مفکر قرآن' علامہ پرویزؒ نے اپنے مدت العمر کے غور و فکر کے بعد ان حقائق کو اپنی معرکہ آرا تصنیف

جہان فردا

میں' صاف' سادہ لیکن دلکش انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں موت و حیات' برزخ' حشر' نشر' قیامت' حساب کتاب' اعمالنامہ' جنت' دوزخ اور حیاتِ جاوداں وغیرہ تمام مباحث آ گئے ہیں۔

یہ بڑی بصیرت افروز اور حقیقت کشا کتاب ہے۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن (علاوہ ڈاک پیکنگ خرچ) Rs : 160 : 00 — مینجر طلوع اسلام ٹرسٹ

سٹوڈنٹ ایڈیشن (علاوہ ڈاک پیکنگ خرچ) Rs 80:00 — 25– بی گلبرگ 2– لاہور

پاکستان میں
علامہ غلام احمد پرویزؒ
کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
1-ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیمال۔ رابطہ: گل بہار صاحبہ	بروز منگل	4 بجے شام
2- ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیمال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	ہر روز	عندالطلب
3- اوکاڑہ	نیو مٹیک حبیب فلور مل نزد بس شاپ 54/2/L دیپالپور روڈ اوکاڑہ رابطہ: شیخ احسان الحق فون:520258/520270	جمعہ	4 بجے شام
4- بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر5۔ رابطہ فون:55438	پہلا اور تیسرا اتوار	10 بجے صبح
5- پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 840945	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
6- پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
7- پیر محل	مکان نمبر140/139- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا اتوار	9 بجے صبح
8- پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے شام
9- جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	4.30 بجے شام
10- جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
11- چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الہٰی کونسلر بلدیہ پیر عٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
12- چک 215 ای۔بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	اتوار	9 بجے صبح
14- حیدر آباد	B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
15- راولپنڈی	بمقام 4385/47-E اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوالمنڈی راولپنڈی فون: 74752	جمعۃ المبارک	4.30 بجے شام
16- سرگودھا	60- اے سول لائنز' ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: 720083	جمعہ	5 بجے شام
16A- سرگودھا	B-4 گلی نمبر7 بلاک 21 نزد مکی مسجد چاندنی چوک رابطہ: ملک محمد اقبال فون (711233)	منگل	7 بجے شام
17- فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	ہر جمعۃ المبارک	3.30 بجے شام

شہر	مقام	دن	وقت
18- کراچی	کراچی سی بریز، روم نمبر 105 شارع فیصل	اتوار	9.30 بجے صبح
		جمعہ	5 بجے شام
	رابطہ شفیق خالد- فون: 0201-713575		
19- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ، 36/C ایریا کورنگی 5	اتوار	11.30 بجے صبح
	رابطہ: محمد سرور، فون: 312631	بروز پیر	بعد نماز مغرب
20- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال- ایاز حسین انصاری	اتوار	10 بجے صبح
	رابطہ فون: 4571919		
21- کوہاٹ	بر مکان شیر محمد، نزد جناح لائبریری	اتوار	8 بجے صبح
22- کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ- رابطہ فون: 825736	اتوار	4 بجے شام
23- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعتہ المبارک	بعد از نماز جمعہ
24- گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	3 شام
25- گھوے کے (سیالکوٹ) بر مکان محمد حسین گھمن		ہر ماہ پہلا جمعہ	بعد نماز جمعہ
26- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	اتوار	9:30 بجے صبح
27- لاڑکانہ	بر مکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ مسجد محلہ جاڑل شاہ	جمعتہ المبارک	بعد نماز عشاء
28- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعہ	5.30 بجے شام
29- ماموں کانجن	بر مکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعتہ المبارک	بعد نماز جمعہ
	رابطہ فون: 04610-345		
30- رانی پور	اوطاق ڈاکٹر سلیم سومرو	جمعتہ المبارک	بعد نماز عشاء
	سومرو محلہ رابطہ شفیع محمد سومرو		
31- واہ کینٹ بر مکان محمد اکرم خان 21-FC/231		بروز بدھ	چھ بجے شام

سعودی عرب میں مقیم حضرات محترم آصف جلیل صاحب (P.O.Box 693) ریاض 11421 سے رابطہ قائم کریں۔

نوٹ۔ ہفتہ وار چھٹی کی تبدیلی کے پیش نظر نئے اوقات سے مطلع فرمائیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔ جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

WHY IS ISLAM THE ONLY TRUE DEEN*?

By
Allama Ghulam Ahmed Parwez®
English Rendering
By
Dr. Manzoor-ul-Haque
Faculty of Education
University of Sind
HYDERABAD

* [First part of this article has appeared in the previous issue of this magazine]

5. The Ultimate Goal Of Human Life (Salvation)

After this, come to the question which is the last word in this deliberation: What is the purpose and climax of all the exertion and struggle of human life? This is a very significant and fundamental question and will automatically clear up a great number of relevant aspects.

In Hinduism: Among all the religions of the world the climax of the trials and endeavours of human life can be stated in a single word: "Salvation." What is the meaning of "Salvation? This warrants a thorough understanding. It is evident that when some one is entangled in a trouble and then gets rid of it. it is called 'Salvation' i.e. it is imperative for salvation that first of all a person be necessarily caught in a calamity. This is the very basic concept about man in the world of religion. Religious belief in Hinduism is that every living being (animates whether insects or animals and humans) comes in this world to complete one's term of punishment of the deeds one committed in one's previous life. For example, a person in his present birth is a human. If he did evil deeds, he will become a rat in his next life, knowing absolutely nothing of which crime it was made a rat. Now if the rat does good deeds --- the rat will do good deeds as if the animals, too, do good and bad deeds! ---- it will perhaps be made a man in its next life; every human being is entangled in the whirlpool of transmigration. The name of getting rid of this circumambulation is "Salvation." It looks obvious that this belief is either the produce of superstition and/or the creation of the astuteness of those people who captured the authority in

* * Islam is not a religion in the concentional sense. According to the Holy Quran it is a way ... Socio Economic System.

the society by one way or the other and then desired this authority to remain within their own families and that the other people may not even think of acquiring this authority. *Brahman* and *Khashatary* were the ruling class and *vaish* and *shoodra*, [1]their servants. It was thought to be possible that a *vaish* or a *shoodra* might think as to how could the children of *Brahman* or *khshatary* be good enough for acquiring the right to rule right from the inception of their birth and that they themselves befall in their servitude thenceforth. Therefore this belief was coined that those born in the family of a *Brahman* has done good deeds in their previous life and those born in the *vaish* and *shoodra* committed evil deeds likewise. Hence this division is effected in accordance with the nature of the deeds accomplished in the previous life and is not the product of any trickery; so they shall have to remain *vaish* and *shoodra* in this life; any how if they do good deeds (i.e. would continuously go on serving the higher breed)they would be transformed into *Brahmans* and *Khashataries* in their coming life. In this way these subordinate classes were made satisfied with this tenet that this was all the reward of their own doings. They were not oppressed, nor were they competent to change this division within the present life.

Whatever be the motive behind this tenet, how dreadful have been its human-inflaming result is crystal clear. Firstly, it makes the man a mere helpless being; whatever he may do, he cannot bring any change in his existing state and, thus, divides the society into such permanent classes which cannot be eliminated and then what eventually is the purpose of this exertion and struggle? --- Only to get salvation from the whirling of Transmigration (the cycle of death and re-birth). How meaningless is the purpose of the creation of man and the cosmos?.

__According to Hindu Mysticism:__ According to Hindu mysticism the soul of man (Aatma) is a part of God (*parmatma)*. It was separated from its source and got entrapped in the marsh of matter and is lamenting for its escape from it. The purpose of human life is that this soul, after getting salvation from the world of matter, be re-united with its source. The methods to achieve this is renunciation of the world. Did you reflect what is the end-product of human exertion and struggle according to this tenet --- the complete annihilation. It means God having separated man from Himself caused him to be entangled in the swamp of matter and told him. "Now, you go through the sufferings of hard labour and distress so that you may attain salvation from this quagmire." Just think, according to this creed, what kind of concept about God himself emerges and what becomes the incentive for obedience to the moral values.

__In Judaism:__ With a slight difference the concept of 'Salvation' is the end product of human life in Judaism also. As has been mentioned before, the basic belief of Jews is that the *Bani Israel* are the favourite children of God, hence the only heirs of paradise; a people not born to the family of *Bani Israel* have no entitlement for

entry into paradise. At that time, the tradition of circumcision was in vogue exclusively in *Bani Israeil*, so their belief was that only the circumcised would enter paradise and the uncircumcised would go into the hell. According to *Talmud*:

> *Abraham* would be sitting by the door of the Hell in the world hereafter and would never allow any circumcised of the *Bani Israel to* enter it. So far the dreadfully sinful of the *Bani Israel* are concerned, he would cut the fore skin of the children who had died uncircumcised and would stick this skin to the place of circumcision of those from *Bani Israel* and hence, making them uncircumcised ,would send them to Hell for a few days.

(*Talmud* , P.404 with Reference to *Barqi-e-Toor*, P.166)

But their entry into Hell would merely be the fulfillment of a formality. The blaze of the Hell would have no effect on them. (Ibid.P.405) The reason for it, as written in "Jewish Encyclopedia", is:

> The blaze of the Hell would not be able to touch the Israelite sinners because they would make confession of their sins by the door of the Hell and hence would return to the Lord.
>
> (Volume- V , P. 583)

Not only for the 'salvation' in the hereafter, but also for the honour and exaltation in this world, the Jews hold this belief:

> Some get honour by virtue of the good deeds of their forefathers and some by those of their coming generations.

(Jewish Encyclopedia, Vol VI, P.60)

According to the Encyclopedia of Britannica:

> The centre of the aspirations of the Jews was the deeds of their forefathers, especially the creed that A*braham* was their ancestral grandfather.

Similarly in the Encyclopedia of Religions and Ethics, it is written that.

> In accordance with the belief of the Jews, all the deeds of their forefathers would be collected at one place and then divided among all the *Bani Israel*. In this way everyone will be entitled to salvation and auspiciousness.

(Vol.11,P.144)

Just reflect! Does any question of obedience to the moral values arise in the presence of these beliefs?

<u>In Christianity</u>: The belief in Christianity is that every child is born bearing the burden of the sin of its first parents (Adam and Eve). Cleansing the ill-effects of this sin from man is not possible in any way. For this purpose, the Lord had mercy on man and sent his only son (Jesus Christ) to the world to atone for this sin with his sacrifice on the crucifix. Those who believe in the atonement of Jesus Christ would get salvation, those who do not believe as such would enter Hell. For salvation there is no question of one's deeds. Therefore in a letter to Ephesians, saint Paul writes:

> **"For by grace you have been saved through faith, and not of yourselves; it is God's gift. It is not by works..."**

(Ephesians 2/8-9)

He also wrote to the Romans:

> **" For we come to the conclusion that a man is justified by faith and not with the works of Law."**

Romans: (3/28).

In a letter to Galatians, this reality has been described in these words:

> **" Those who depend on the works of law live under the curse, for it is written "cursed is everyone who does not abide by all that is written in the book of law." But that no one is made righteous in God's presence through the Law is evident, for "He who is righteous through faith will live". The law however does not rest on faith,.....Christ has ransomed us from the curse of the law in as much as He became a curse for us.**

(Galatians- 3/10-14)

Just think, with this belief, are the moral actions left with any locus standi and contrarily the one who relies on the deeds is considered cursed. According to this belief of Christianity the distress the man gets entangled in is not the result of any his crimes, but a chastisement of the sin of his first parents in which that poor fellow is implicated for no fault at all. The acquittal from this suffering is not attained as a recompense of any good action on his part, but the conviction on the belief on the atonement which the Christ offered. So far as the belief of the "original sin" being fallacious is concerned, the scholars and researchers of Christianity are publicly declaring it to be a false belief, for example, R. F. Johsnon writes in his book

"Confucianism and Modern China",

> **The belief of the original sin, in fact, is the "original dilemma" for which we are displeased with every kind of good and are inclined to every type of evil.**

> **For this belief, A.E.Taylor writes:**

> **The belief is a refutation. I'll welcome any scientific and God calling religion which may ward us off to believe in such a droll calumny of human nature.**

(Mind- July 1912).

<u>According to the Holy Quran</u>: This Scientific and inviting-to-God Religion is Islam which pronounced that neither any human comes to this world loaded with the sins of the previous birth, nor, is entangled in the contamination of the first parent's faltering. Every child in the world is born with a clean slate and is worthy of respect. He has been bestowed with potentials as realizable possibilities for leading a life higher than that of the physical life at the animal level. The development of these potentialities is the goal of the human life. If man develops the potentialities of the physical life only, he gets the comforts and forces of the physical world but never does it come to his lot the higher life at the human level which the Holy Quran denotes as the paradisiacal life.

> **"The one who seeks immediate gains of the physical life alone, according to Our Law, which we have formulated with Our Choice, We grant him with haste. But his (human) life is a life of crisis which he leads with disgrace and ignominy. But the one who, along with the physical life develops the human life as well, he acquires the physical gains and his personality also keeps evolving. (Al-Quran 17/18)**

> **"And the one who desires the pleasantries of the future and puts forth efforts in proportion to what ought to be and believes in the truth of the prescribed higher-order values of God, his endeavours are recompensed in full." (Al-Quran 17/19)**

> **"We promote this group according to Our Law and also that group and shower Our bounties in proportion to their efforts and actions. Always remembers, We have not built any dykes against Our bounties for any one."(Al-Quran 17/20)**

This development of the human personality can take place in a system that is

established on the foundations of PERMANENT VALUES. This development is the other name of 'the natural consequence of actions.' Good actions are those which promote stability and integration of the human SELF, the evil are those which cause it to grow weak and disintegrate. The result of each action draws up concomitantly on the human personality. This is its ROLL OF CONDUCT, which in the words of the Holy Quran, is hung around the neck of every one and opens up on the eve of manifestation of results. The human personality developed on a set criterion, will be able to pass through the next evolutionary stages of life.... This is called the paradisiacal life in the hereafter. That, which does not come up to that standard, will stop its development..... This is the life of Hell. The Holy Quran has interpreted it as measures (of good deeds) being heavier or lighter

> "so the one whose measure weighs heavy will have a pleasing life and the one whose measure weighs lighter, abyss will be his abode." (Al-Quran101/6-9)

Have you observed that according to the Holy Quran the purpose of life is not liberation from any suffering but to achieve a higher position in life with proper development of the endowed potentialities and reach a higher and exalted stage of life as compared to the existing one. The Holy Quran has denoted it in terms of "achievement and success" and not salvation. You must have also observed from this that a satisfying and an elegant answer is obtained to the questions: 'Why should I abide by the moral values? What benefit does it accrue to me and what loss do I undergo by going against them. This is the only way on the basis of which man obeys these values rationally and follows them with complete satisfaction of the mind and the heart.

Ad-Deen: You would have observed from the above explanations that the Holy Quran does not only specify a few moral values but also provides a comprehensive system of life raised on the basic concept of God-man-Universe-Law of Requital and purpose of life. The name of this comprehensive system is *Ad-Deen* and its practical implementation is called Al-Islam. The moral values only produce their results under this system and become rationally workable as well; besides, there is no other system through which the purpose of such type can be realized. That is why it is said :

> " It is a fact that Ad-Deen (way of life) acceptable to God is only Islam." Al-Quran 3/18)Therefore,

> "If any body wants to adopt any system other than Islam, this system would not be accepted from him and he would eventually know how big a loss he has suffered." (Al-Quran 3/04)

<u>Ad-Deen will be adopted in totality:</u> The concept of the system brings forth this factor also that the results of its constituents can only be drawn up when it is adopted in its totality. The example of the system is like the doctor's prescription. This prescription can only be effective if you use it wholesomely in accordance with the directions of the doctor. Taking one or two items of this prescription will not cure the ailment; but on the contrary partial use of this prescription may induce harmful effects. Hence the Holy Quran says :-

> "Do you want to accept one part of this code of laws and refute the other? whoever from amongst you do this, its result would be nothing except ignominy and disgrace in this world, and he will be returned to the most grievous suffering on the Day of Judgement."(Al-Quran 2/85)

The constituent parts of this prescription are those characteristics of Allah which the Holy Quran terms as the "Balanced Attributes" *Asm'aui Husna*--- Adopting some of these attributes and ignoring others can be of no avail. Always bear this fact in mind that Reality is an indivisible whole, it cannot be split up into its parts. The balanced Attributes of Allah are various facets of Absolute Reality. REALITY is the name of their sum-total. If some of these are separated, you cannot term these segregated constituents alone as the parts of that REALITY. For instance, if REALITY comprises one hundred aspects and you take up only ten, you cannot claim that you have adopted one-tenth of the REALITY, therefore you would be entitled to the proportional benefit. You cannot get one-tenth of healing by taking one out of ten medicines written in the prescription; so the Holy Quran says:

> "And for Allah are all the Balance Attributes. (These are the various facets of that Absolute Reality) so call Him by all these facets and leave those people alone who deviate to one extreme in (emulating a few of) His Attributes."(Al-Quran 7/180)

You would observe that with the people, who remain cut off from the Islamic System of life, the moral values on which emphasis is laid, are those values which pertain to the tender and delicate emotions of man, like sympathy; mercy; forgiveness; tolerance; humbleness; soft-speaking, to be silent even if some one abuses; to offer other side if some one gives a slap on one side of your cheek, to give over your waistcoat yourself if some one takes away your coat; to love even your enemy or go a bit further, feed the sparrows, the crows, to provide a drinking place for cattle etc. Justice, prevention of oppression and exploitation; preservation of universal human rights; a political system in which no one is subservient to anyone; a social set up which is based on respect for man; an economic order in which no one is dependent upon any one and every one's necessities of life are guaranteed without any undue labour and ignominy; such a social contract in which every action progressively goes on producing its own rightful result--- All these matters will have

no moral significance with these people.

<u>Result of the Teachings of Christianity:</u> About Christianity, which is the biggest upholder of the kind of moral values mentioned above,, go through the words of a well-renowned Spanish professor. Dr. Falta De Cracia quoted by Brifault in his renowned book " The Making of Humanity." He writes.

> " The notion of justice," says the famous Spanish Professor, " is as entirely foreign to the spirit of Christianity as is that of intellectual honesty. It lies wholly out side the field of its ethical vision.... Christianity has offered comfort and consolation to men who suffered under injustice, but of that injustice itself it has remained absolutely incognizant. It has called upon the weary and heavy laden, upon the suffering and the afflicted, it has proclaimed to them the law of lover, the duty of mercy and forgiveness, the Fatherhood of God; but in that torrrent of religious and ethical emotion which has impressed men as the summit of the sublime, and been held to transcend all other ethical ideals, common justice, common honesty have no place. The ideal Christian, the saint, is seen descending like an angel from heaven amid the welter of human misery, among the victims of ruthless oppression and injustice, bringing to them the comfort and consolation of the Paraclete, of the Religion of Sorrow. But the cause of that misery lies wholly outside the range of his consciousness; no glimmer of any notion of right and wrong enters into his view of it. It is the established order of things, the divinely appointed government of the world, the trial laid upon sinners by divine ordinance. St. Vincent de Paul visits the living hell of the French galleys; he proclaims the message of love and calls sinners to repentance; but to the iniquity which creates and maintains that hell, he remains absolutely indifferent. He is appointed Grand-Almoner to His Most Christian Majesty. The world might groan in misery under the despotism of oppressors, men's lives and men's mind might be enslaved, crushed and blighted; the spirit of Christianity would go forth and comfort them, but it would never occur to it to redress a single one of those wrongs. It has remained unconscious of them. To those wrongs, to men's right to be delivered from them, it was by nature completely blind. In respect to justice, to right and wrong, the spirit of Christianity is not so much immoral as amoral. The notion was as alien to it as was the notion of truth. Included in its code was, it might be controversially alleged, an old formula,' the golden rule.' A commonplace of most literature, which was popular in the East from China to Asia Minor; but that isolated precept was never interpreted in the sense of justice. It meant forgiveness, forbearing, kindness, but never mere justice, common equity; those virtues were

far too unemotional in aspect to appeal to the religious enthusiast. The renunciation of life and all its ' vanities,' the casting overboard of all sordid cares for its maintenance, the suppression of desire, prodigal almsgiving,the consecration of a life the value of which had disappeared in his eyes to charity and love, non-resistance, passive obedience, the turning of the other check to an enemy, the whole riot of those hyperbolic ethical emotions could fire the Christian consciousness, while it remained utterly unmoved by every form of wrong, iniquity and injustice."

<u>The Case of Irreligionists:</u> This, in a nutshell, is the wholesomeness of moral values upheld by the religionists. Now take the case of the people who do neither believe in God, nor in the continuance of human personality, nor in the revelation, nor in the life hereafter, but, on the contrary, stress upon the moral values. Ask any one of them: " When you say that (for example) the poor should be helped; tell me, why should I help the poor?" You will observe that they give you strange answers: Some will say, "Helping the poor is a human obligation" ask them, "Sir, what do you mean by human obligation and who is he who has imposed this obligation on me? You'll observe they would have no reasonable answer to these askings. Some will say that they ought to help the poor for if they become poor in the coming days, some one else may help them. Firstly, this reciprocity is of such a low caliber that you would never call it a character of any high order; then also keep this factor in mind, ' If the people become able to manage not to be in need of anyone at any time, how would you prevail upon them to help the poor?" You will observe they will out-rightly make an appeal to the human emotions; they will not be able to give you any reasonable answer based on arguments. If you think a bit deep, you would find that such feelings would be lying in their subconscious: that since the society values these matters, therefore these ought to be done for the sake of becoming respectable in the society; and/or some political motives would be operative behind this phenomenon, such as hospitals, schools and colleges of the missionaries or the non-violence of the Indian leader *Mahatama Gandhi* (late); or it would have been the result of traditional and inherited belief; and/or the weak nerves of the humans which have been termed as virtuous emotions. You will observe that none of these can work as the basis of the human character. So far as the question of national character is concerned, it has been discussed in the beginning of this discourse. By appealing to these emotions, you can get some one do good work provisionally but cannot make this work to be a routine of his life; you cannot produce permanence in it, while character is the very name of permanence and changlessness in behaviour. The surety of this permanence can be nothing but the belief in the true 'concept of life.' That is why the Holy Quran invites people who are already the followers of religions, as well as those who acknowledge any religion to profess *Eiman*, accept the concepts of life which are the very essence of its ' Order.' It says about them that:

"If these people profess *Eiman* as you have, then these people can

follow the right path of life. If they repudiate, then make it a point that these people are opposing the truth and the rightful; they are not following that path."(Al-Quran 2/137)

These are the very characteristics of Islam which are found neither in any of the religions of the world, nor in the world of thought and intellect. Therefore, there can be no true Deen (rightful way of life) other than Islam.

Warning to the Muslims: I want to give necessary warning at this juncture. Our state of affairs at this stage is that we become very happy when we say: our Deen is superior to all the religions and then, sit back and believe that this makes us the best in the comity of nations and (that if we are no good in this world, it makes no difference, because this is only a transitory world and on its coming to an end) we will be the one to inherit the paradise in the world hereafter; the rest of the human beings will all enter the Hell.

Actions Make Life: This is the biggest self-deception we are caught in. (The Holy Quran tells us this was exactly what the Jews used to say; this brought them to a state of life which is clear to the world today) Islam's being superior can only be useful to us when we ourselves attain superiority by acting in accordance with it; leading a life of disgrace and abjection, and remaining puffed up on the superiority of Islam is nothing but a stupidity. It is just like a person who consecutively propagates worldwide that he has a tested prescription --- an elixir of life, a proved cure of all diseases --- but for the cure of his own headache, he remains awfully busy searching for such a medicine from others. Please tell me: "What benefit can that prescription bring to such a person and his boasting of it can be of what use to him? This on the contrary, would make him a laughing stock in the world and no body would rightly admit his pretension. The foremost and basic proof of this prescription having been tested over times would be the very state of health of his family. Islam has presented the same proof of its truthfulness and preference when the Holy Prophet told the antagonists of this Deen that : (Al-Quran 6/136)

"You go on working according to your system; I shall keep working according to my own; very soon it would be known to whom does the success eventually belong. In this way my claim would come true that *Zalimeen* (Oppressors) can never prosper;"(Al-Quran 6/136)

and the sayer of such sayings, first of all, presented himself as a witness to the proof of the truthfulness of his claim. When his opponents asked him: "What proof of it you have that you are true in your claim: He answered in the words of Quran:

"I have dwelt amongst you all my life prior to it. Can't you adjudge from it whether such a life is of the truthful or a liar?"(Al-Quran 10/10)

Remember, my respected and honoured comrades! Only that person can present Islam to the world as the rightful way of life (true Deen) who is, not only in the company of his friends but also in the big crowd of his foes, able to project his life in proof of his truthfulness and then no one has ever dare to oppose him. This is the only right mechanism for-proselytization of Islam.

<u>'The Quran Affirms What You Hold'</u>: Now, at the end I deem it necessary to do away with one or two doubts which often emerge in the mind of the people in this regard The first is that the Holy Quran tells the followers of other religions: 'I affirm what you hold" i.e. the teachings you have, so the question is when the Holy Quran itself professes the teachings of these religions, how can it be asserted that the true teachings of God are found exclusively in the Holy Quran and not with other religions:

The objection indeed carries weight and merits necessary consideration. First of all see if it is the Holy itself which demands the followers of other religions to pin their faith upon this claim, or is this assertion presented by the Muslims alone? The complete verse containing this affirmation reads as follows :

> "Profess belief in this (Book) which I have (now) revealed (namely the Holy Quran) which affirms. What-thou-have' and lead not in repudiating it." (Al-Quran 2/41)

It is clear that the Holy Quran itself urges upon the followers of the religions to profess belief in it.

Secondly, there is explicit clarification in various places of the Holy Quran that the followers of these religion had made transpositions in their heavenly books; literal transposition (Al-Quran 4/71) and additions in them on their own (Al-Quran 2/79); and intermingling the truth with the falsehood (Al-Quran 3/71); in this way numerous contradictions had crept in these books (Al-Quran 11/110). The followers of these religions themselves stand in witness to these claim of the Holy Quran. Hence not a single non-Muslim today can make a claim based on reason that the book they present as heavenly is in its pristine and original form i.e. the same book which was revealed to their prophet. You will find the details of this resume in the first chapter of my book, '*Mairaj*-i-*Insaniyyat*', in which the history of the so-called heavenly books of all the religions has been described. This makes it clear that:

"How can the Holy Quran stand witness to the truthfulness of these books, the followers of which themselves do not call them original and free from interpolation? And how, in spite of the interpolation and additions to such an extent, some moral values are still found in these books, the Holy Quran affirms these values but not the

books in their totality. The fact is that the meanings of *Mussadaq* (the affirmer) here are not the one that testifies the truthfulness," its meanings are the one that proves the truth contained in them " The Holy Quran says: "The moral values you hold are merely theoretical in nature. I give the system in which these values will emerge as the true realities and this is my special feature; for example, You also say the hungry should be fed and I too, you say this as a mere sermon and advise and insist on giving alms to the people; how is the hunger of the hungry cured with it, every one knows; I give such a practical economics system in which no individual can remain hungry; in this way I prove the truth of those moral values."

The distinctive features of Islam is that with its practical system all these moral values are realized as truths. This is alone possible in Deen, not in "religion?" That is why Islam has been termed as Ad-Deen (the way of life)--- and not religion, so its comparison should be made with other systems of life, not with other religions.

The second Doubt: The second question that raised is that there are innumerable people to whom Islam has not reached yet; or (for example) a person is born to a Hindu family and obeys very honestly his religion, thinking it to be truer, what is the fault of such a people due to which the avenues of prosperity (success) and achievement be closed to him? This questions confuses and perplexes many minds, therefore its thorough understanding is a must.

Had the matter of salvation and auspiciousness or reward and punishment been merely emotional, it would have been acceptable as to why a people who are not at fault be punished at all. But when reward and punishment pertain to law, and success and achievement be the name of the natural consequences of actions, the emotions cannot have any say in it, for example the children of the village with no school will remain illiterate and hence deprived of the benefits that the literate will get. This is the most severe punishment these children are inflicted to, though they are not at fault. How sympathetic you be to them, but the deficiency that has crept in by being illiterate is the one that cannot be made up even by your sympathies and subtle emotions. Here the questions whose-fault-is-it does not arise. If a child does not go to school for one year complete due to illness, you do not promote him to the next class only on the pretext that he is not at fault. Only that child would be promoted to the next class who has developed ability to be at par with. According to the Holy Quran, only that person would reach the next stage of life who has developed the potentiality to traverse these stages.

The same principle will also be applicable to those who, thinking their religions to be true, follow their religion all their life in good faith. Some one's eating of arsenic as medicine in good faith, will not restrict its ill-effects to him on the pretext that its eater had taken it honestly as medicine. The arsenic will produce its effects unequivocally whether some one has taken it consciously or inadvertently. The nation that worships fire and water (*Agni and Indar*) cannot gain control over

and run steam engines with this belief. It is clear that such a nation will remain deprived of all benefits liable to be attained with the power of steam. This deprivation of theirs is not a revengeful punishment inflicted on them by any one else. it is the natural consequences of their ignorance; which no passion of sympathy can remove; it can only be possible if and when the nation recourses to the law of Allah, harnesses the forces of nature and then makes use of them for their benefit. According to the Holy Quran, this alone is the law prescribed for success and achievement. Neither any body's aspiration have a play in it nor emotions. It has very clearly been prodaimed that

> "The judgement will neither be made in accordance with your wishes, nor with the wishes of the " people of Book"(judgements will be made according to Our Law)" (Al-Quran 4/123)

and that law is that whoever does wrong shall suffer the consequen thereof.

And the law ought to be as such. If the law starts following the wishes of the people, the system of the entire Universe would go into chaos :

> "If the truth starts following whims and wishes (feelings) of the people, there would be chaos in the earth and the heavens and whatever is there in between," (Al-Quran 23/70)

God can alone be the One who is over and above feelings. That is why the Holy Quran says about the nations which are ruined as the result of their crimes that:

> "Their *Rabb* sent – the Road- Roller of the Law of Requital; which leveled them with the ground; and He feared not its consequences" Al-Quran 91/14-15)

He had no anxiety on their total annihilation. He did never throb and palpitate on it, so much so that :

"neither the sky wept on them nor the earth ." (Al-Quran 44/29)

But do not think that His Law has no provision for recantation and revival and if some one committed a crime any time, he became accursed for ever. No, there is every opportunity of reforming after repentance:

> "Tell them: O' My men, those of you who have committed excess against themselves do not get disappointed from the blessings of God. He will protect you from the harmful effects of all your prevarication." :(Al-Quran 39/35)

Its method is to do such good deeds which put away the loss done to you with your faltering, because :

> "The harmful effects of deeds creating unevenness can only be effaced by deeds creating beauty and consistency."(Al-Quran 11/115)

Our Responsibility: Now the last thing is that there are people who could not get the message of Islam. "Who is responsible for it? Obviously its responsibility lies on us, the claimants of the inheritance of the Book. If we are unable to shoulder our responsibility , the burden of wrong-doings of those whom we did not convey the message of Islam lies on our shoulders. That is why the Holy Quran says that :

> "They will carry their own burden as well as that of others." :(Al-Quran 29/13)

Today in the absence of the system based on truth and righteousness, the nations of the world are committing inhuman crimes. A part of its chastisement lies on our own shoulders and our present condition is a clear proof of this phenomenon. God assigned to us the duty of superintendence of the comity of nations. Leaving the watchfulness of others aside, we are no longer capable of maintaining ours, therefore we today are paying (the penalty) for it. Whenever there is a theft any where, it is the sleepy guard that is always doomed forthwith, so we are suffering the chastisement of this negligence and our claim that Islam enjoy superiority over all other systems can not save us from this torment and will never save us till we prove ourselves worthy of its superiority by acting on it.

At the end, I deem it necessary to explain that whatever I have said in this treatise is neither desired to offend followers of any religion, nor intended to despise (God forbid us) any of the founders of these religions; according to the Holy Quran, we have *Eiman* (conviction) that God sent messengers to all the nations of the world; out of them the Holy Quran has mentioned a few by their respectable names and the rest of them have not been mentioned by name. But whether the name of any one is given in the Holy Quran or not, we pay respect to these Messengers from the core of our heart, so much so that the confession of their *Risalat* (Divine Mission) is an integral part of our *Eiman*. The Holy Quran says that the truthful teachings of God were presented to them but later on these teachings were either reduced or added to; now these pristine and original teachings are only preserved in the Holy Quran. When we represent the reality that Islam is the only true Deen of God, then its teachings would have to be invariably compared with that of other religions and those found against the Holy Quran cannot be true from our point of view. Whatever I have described about the teachings of other religions is only in the perspective of this purpose. This reality should always be kept in view that Islam does not want to prove itself better by speaking ill of others; it represents its goodness rationally, and prevails upon others for its acceptance rationally. The Holy Quran enjoins us. "Do not call names to the idols of the polytheists". it teaches to be respectful to the worthy - of - respect personalities of the whole world, but, of course, it shows the fallacy of teaching assigned to them. This should also be our mode of conduct.

DARS-E-QURAN (ABROAD)

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)

BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1. **CANADA**
627 The West Mall — First Sun
Suite 1505 Etobicoke, ONT M9C 4W9
(416) 245-5322 Or 620-4471 — 11AM

2. **DENMARK**
Mr. M.Afzal Khilji, — Last Sat
Gammel Kongevej 47,3.th., 1610 Kobenhavn V — 1900 Hrs

Kuwait
Flat No. 6, Floor No. 3 — Friday
Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque, — 9:30 AM
Hawally, Kuwait

4. **NORWAY**
Galgeberg, 4th floor — 1st Sun 4.PM

Trosvik Snippen.3 — Sunday
1610. Fredrikstad — 12.PM

5. **UNITED KINGDIM**

(i) Birmingham — Sunday
229 Alum Rock Road — 3PM

(ii) London
76 Park Road Ilford Essex — 1st Sun
Phone 081-553-1896 — 2:30PM

(iii) Yardley
633 Church Road, Yardley, Birmingham — Last Sun
B33 8HA (Phone 021-628-3718) — 2PM

(iv) Essex
50 Arlington Road, Southend-on-Sea — 2nd Sun
ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819 — 3PM

(v) Yorkshire
Cardigan Community Centre — 1st Sun
145-49 Cardigan Road LEEDS-6 — 3PM
Contact M. Afzal Phone 0532-306140

Dars-e-Quran
Oslo (NORWAY)TV — Time under consideration